

میں تیرا لباس ہوں

نسیم ریاست



میں تیرا لباس ہوں

زندگی میں دو طرح کے لوگ آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے۔ ایک وہ جن کو گھر سے مکمل اعتماد ملتا ہے۔ اُنکے ہر کام کے پیچھے اُنکے گھر والوں کی مدد شامل ہوتی ہے۔ اگر کبھی غلط فیصلے بھی لے جائیں تب بھی اُنکے خونی رشتے اُنکو چھوڑ نہیں دیتے ہیں۔ اعتماد دینے والے ماں باپ ہوتے ہیں۔ جن کا انسانی زندگی میں وہی مقام ہے جو کہ ایک انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کا ہوتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی جواب دے جائے تو ایک جیتا جاگتا انسان اپنا ج ہو جاتا ہے۔ نہ بیٹھ سکتا ہے، نہ کھڑا ہو سکتا ہے، اپنے ہاتھ سے کھانا تک نہیں کھا سکتا، خود کا لباس تبدیل کرنا یا زندگی کی دوڑ میں پورا آنے کے لیے روزمرہ کے کام انجام دینا تو ناممکنات میں سے ہے۔

جن لوگوں کے ساتھ ماں باپ کی جانب سے حوصلہ افزائی، اعتماد اور محبت نہ ہو، وہ زندگی کا ہر قدم لڑکھڑاتے ہوئے اٹھاتے ہیں۔ اُنکو کبھی کسی کی محبت پر یقین نہیں آتا ہے۔

میسیم طلال پہلی قسم کے لوگوں میں سے تھا اور جس لڑکی کو اللہ نے اُسکے لیے چننا، اُسکا شمار دوسری قسم سے تھا۔ پچھلے ایک سال سے اُس نے نا جانے کتنی مرتبہ اپنے کپڑے اپنے سامنے رکھ کر پڑھا تھا۔ ایک ایک لائن، ایک ایک حرف پڑھنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ”رباب عالم نے جو فیصلہ لیا اُسکے پیچھے میسیم طلال کی

کوئی غلطی نہ تھی۔ زباب عالم کی زندگی میں ہونے والے اُس ایک حادثے کی غلطی تھی جس حادثے نے دونوں کو ایک کیا تھا۔“ یہ بات سمجھ جانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اب اُسکو زباب پر غصہ آنا بند ہو گیا تھا یا میسم طلال نے اپنی صورتحال سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ اُسکو آج بھی پہلے دن جتنا ہی غصہ تھا۔ آخر کیا سوچ ریوہ یہ سب کر گئی۔ اب اُسکی جنگ صرف اُسکے اندر تک محدود ہو چکی تھی۔ اُسکو شکوہ زباب عالم سے تو تھا ہی مگر اب خود اپنے آپ سے بھی شکایت تھی۔

اگر زباب عالم ایک عورت ہونے کے باوجود ایک مہینہ اُس کے ساتھ کے گزار کر بھی ڈھنی اور دلی طور پر اُسکو قبول نہ کر پائی تو وہ مرد ہو کر کیسے پہلے ہی مقام پر گھٹنے ٹیک گیا۔ چلو بات اگر زباب کی موجودگی میں اُسکے خوبصورت چہرے کو دیکھ دیکھ کر فدا ہونے کی ہوتی تو ٹھیک بھی تھا۔ یہ کیا کہ اُسکو چھوڑ کر گئے اتنا عرصہ بیت گیا اور میسم طلال آج بھی اُسی مقام پر کھڑا ہے جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اگر عورت زیادہ کپرو مائیز کرنا جانتی ہے تو وہ ہر روز خود سے پوچھتا کہ کیا میں اس قابل بھی نہ تھا کہ وہ میری خاطر اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کرتی۔ کیا جو کچھ اُسکے ساتھ ہوا تھا اُس میں میرا قصور لگتا تھا؟

اُس دن صبح سردی معمول سے زیادہ تھی۔ آج اُسکا چوتھا پیر تھا اس لیے صبح جلدی اٹھ کر تیار ہو گیا۔ زباب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اُسکو آرام کرنے کا بول کر وہ نیچے آ گیا۔ خدیجہ بیگم نے اُسے دیکھتے ہی میز پر کھانا لگا دیا۔ میسم اپنی گاڑی پر جاتا تھا جبکہ اُس سے چھوٹی ملیجہ کے لیے وین لگی ہوئی تھی۔ اسی ملیجہ روز اُس سے آدھا گھنٹہ پہلے جاتی تھی۔ وہ گری گھسیٹ کر بیٹھا۔ اور ناشتے سے انصاف کرنا شروع کیا۔

”آج زباب تمہارے ساتھ نیچے نہیں آئی؟“

”امی مجھے اُسکی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ شاید ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ میں واپس آ جاؤں تو پھر ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔ تب تک پلیز آپ اُسکو دیکھ لیں۔“

”ارے۔۔۔ یہ بھی کوئی کہنے والی بات ہے۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ نا جانے تمہیں آتے ہوئے کتنی دیر لگ جائے۔ میں ڈاکٹر شمسہ کو فون کرتی ہوں۔ ہسپتال جانے سے پہلے زباب کو دیکھ جائیں۔ دوا کی ضرورت ہوئی تو ڈرائیور لادے گا۔“

”چلیں جیسے آپ مناسب سمجھیں۔۔۔ میں تو چلا۔۔۔“

وہ اپنی فائل اور گاڑی کی چابی وغیرہ لیکر نکل گیا۔

خدیجہ نے اُسکو اللہ کے سپرد کیا اور ملازمہ کو برتن سیٹنے کا بول کر خود اوپر آ گئیں۔۔۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی انہیں شدید جھٹکا لگا۔ زباب کی آواز واش روم کے کھلے دروازے سے آرہی تھی جہاں وہ تے کرتے ہوئے، ساتھ ساتھ زار و قطار رو بھی رہی تھی۔ ہکا بکا سی خدیجہ تیزی سے آگے بڑھیں۔ کموڈ پر جھکی ہوئی زباب کی کمر سہلاتے ہوئے انہوں نے نرمی سے اسے تسلی دی۔

”روتے نہیں بیٹا۔۔۔ اٹھو کلی کر کے پانی پیو۔ میسم کا اندازہ ٹھیک ہی ہے۔ تمہیں یقیناً ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔ ساتھ تمہارے لیے انڈے وغیرہ بنواتی ہوں۔ کل شام جب تم لوگ دعوت پے گئے ہو اُس وقت اتنی ٹھنڈ کے باوجود تم نے کوئی جرسی وغیرہ نہیں پہنی تھی۔ وہیں سے اثر ہوا ہوگا۔“

وہ اُسکو اپنے ساتھ لگائے اندر کمرے میں لے آئیں جہاں وہ بے حال سی ہو کر بیڈ پر گر گئی۔ ڈاکٹر آئیں مگر بالکل ہی توقع کے برعکس خبر دیکر گئیں۔

خدیجہ بہو کی گود ہری ہونے کی خبر سن کر پھولی نہیں سارہی تھیں۔ ڈاکٹر شمسہ حالانکہ اُنکی دوست اور محلے دار بھی تھیں مگر پھر بھی یہ خوش خبری سنانے پر انہوں نے ڈاکٹر کو نیا جوڑا اور پانچ ہزار کیش دیکر رخصت کیا۔ اُنکا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی کہ ابھی شوہر اور بچوں کو فون کر کے سب بتائیں مگر ساری توجہ زباب نے کھینچ لی جو ہچکیوں سے روئے جارہی تھی۔ خدیجہ کا دل بیٹھنے لگا۔

”کیوں خود کا ہلکان کر رہی ہو؟ کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ۔۔۔ میں تمہاری ماں ہی ہوں۔“

وہ تڑپ کر رہ گئیں تھیں جب جواب میں زباب نے اُنکے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”پلیز میری مدد کریں۔ میں ایسے زندہ نہیں رہ سکتی ہوں۔ میرا دم گھٹتا ہے۔ میں مر جاؤ گی۔ مجھے اپنے وجود

سے گھن آتی ہے۔ میرا دل کرتا ہے۔ میں اپنے آپ کو ختم کر دوں۔ میں یہ بچہ نہیں رکھ سکتی ہوں۔“

”دیکھو بیٹی میں سب سمجھتی ہوں۔ تم پریشان ہو اور ابھی حالات کو قبول نہیں کر پائی ہو۔ مجھے تمہاری آنکھوں کی ویرانی پریشان بھی کرتی ہے۔ پر بیٹے جو کچھ ہوا ہے، اُس میں ہم لوگوں کی تو کوئی غلطی نہیں ہے۔ میسم بھی کسی

غلط جذبے کے تحت تمہارے گھر نہیں گیا تھا۔“

وہ اُنکی بات کاٹ کر درمیان میں چینی۔۔۔

”میرے سامنے اُنکا نام بھی مت لیں۔ آپ نے اُنکی شکل دیکھی ہے۔ ایسے سب کے سامنے ہشاش بشاش نظر آتے ہیں جیسے میری اُنکے ساتھ پسند کی شادی ہے۔ اُنکے سارے دوست میرے بھی یونیورسٹی فیلو ہیں۔ وہ لوگ مجھ پر ہنستے ہوئے کہ اپنی مرضی اور ماں باپ کی مخالفت سے میں نے یہ شادی رچائی ہے۔ لوگ تو یہی سمجھیں گے۔ میرا اُنکے ساتھ پہلے سے ہی تعلق تھا۔ کون میری بات کا یقین کرے گا۔ آخر اُنکو میرے پیچھے میرے گھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میری زندگی تو پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہ بھی صرف آپکے بیٹے کی وجہ سے ہوا تھا۔ بلکہ میری اپنی غلطی تھی۔ مجھے اُس رات وہیں اکیلے اکڑ کر مرجانا چاہیے تھا۔ مگر اُنکی مدد قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھے اپنے ابو کی مخالفت مول لیکر گھر سے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میرے ساتھ یہ کیا ہو گیا ہے؟ پلیز آپ مجھے بتائیں کیا میں کوئی بری لڑکی ہوں۔۔۔؟“

خدیجہ نے اُسکو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

”تم تو اتنی نیک دل لڑکی ہو۔ دیکھو اب گزری سب باتوں کو بھول جاؤ۔ اللہ پاک تمہیں ماں کے زبے پر فائز کر رہا ہے اور یہ بڑی مقدروں کی بات ہے۔ یوں رو دھو کر اس نعمت کی ناشکری نہیں کرتے ہیں۔ تم نے جب کوئی غلط کام کیا ہی نہیں ہے تو لوگوں کی پرواہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سب سے اہم بات تمہارا شوہر تمہاری فکر کرتا ہے۔ ابھی جانے سے پہلے مجھے تمہارا خیال رکھنے کی تاکید کر کے گیا ہے۔“

”مجھے اُنکی فکر چاہیے، نہ وہ چاہیے۔۔۔ میں اس آدمی کے ساتھ مزید ایک پل نہیں رہ سکتی۔ پلیز مجھے جانے دیں۔“

”اچھا رونا تو بند کرو۔ میسم آتا ہے تو میں اُسکو کہتی ہوں۔ وہ تمہیں تمہاری امی سے ملو الائے۔“

”وہ مجھے کہیں بھی نہیں جانیں دیں گے اور میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی اس قید خانے میں مروں گی۔ اُنکے بچے پیدا کروں گی۔ جس زندگی نے مجھے اتنے دنوں میں تھکا دیا ہے۔ آپ لوگ چاہتے ہیں۔ میں یہ جھوٹ، فریب کی زندگی اس لیے جیتی جاؤں کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ میں نہیں رہوں گی نہ ہی ایسا بے معنی تعلق جیوں گی۔“

آپکا بیٹا آئے تو بتا دیجئے گا۔ مجھے اُنکے ساتھ نہیں رہنا۔ اگر میری بات نہ مانی تو میں خود کو اور اس بچے کو ختم کر دوں گی۔“

خدیجہ اُسکا جنونی انداز دیکھ کر ڈر گئیں تھیں۔ اُسی وقت اُسکو تیار کروا کر ڈاکٹر شمسہ کے کلینک پر لیجا کر اس کا سارا تفصیلی معائنہ کروایا اور شمسہ کی بتائی گئی احتیاط کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُنہوں نے وہ فیصلہ لے لیا جو کہ عام حالات میں شائد ہی لیتیں۔

☆.....☆.....☆

جلد گھر واپس آنے کی کوشش کے باوجود وہ دن ڈھائی بجے گھر پہنچا تھا۔ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ کمرہ صاف ستھرا اور خالی تھا۔ جس کی تلاش میں وہ وہاں آیا تھا وہ وہاں نہیں تھی۔ پھر اُس نے سارا گھر دیکھ لیا مگر اُسے ملنا تھا نہ ملی۔ خدیجہ نے مختصر کہہ دیا۔

”وہ چلی گئی ہے۔“

”کیا مطلب چلی گئی ہے؟“

”وہی مطلب ہے جو بنتا ہے۔ وہ یہاں مزید رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے واپس چلی گئی ہے۔“

وہ اپنی جگہ قہقہے کے رہ گیا۔ بے یقینی سے ماں کا چہرہ پڑھا جو کچھ بھی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔

”امی میرے علاوہ اس وقت اُسکا کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہے۔“

”یہ تو اب وہ خود ہی جانے۔۔۔ مجھے تو بس اتنا کہا کہ جارہی ہوں اور مزید کچھ کہے بغیر نکل گئی۔“

”یہ ناممکن ہے۔“

وہ رات تک پاگلوں کی طرح اُسکا نمبر لٹرائی کرتا رہا تھا جو مسلسل بند جاتا رہا۔ کسی خیال کے تحت اُس نے اپنے کمرے کی الماریاں کھول کر دیکھیں۔ رُباب کے کپڑے جوتے وہیں ویسے کے ویسے ہی رکھے تھے۔ جو دیکھ کر تسلی ہوئی مگر کچھ چیزیں غائب تھیں۔ جیسے کہ واش روم سے اُسکا ٹوتھ برش، کپڑے جو وہ عام پہننے والے کپڑے علیحدہ سے رکھتی تھی، وہ بھی غائب تھے۔ اسکے علاوہ بیڈ روم سلپر، ہاتھ گاؤن، اندرونی خانے میں رکھا اُسکا

شناختی کارڈ اور نکاح نامہ وغیرہ سب غائب تھے۔

اسی دوران اُسکی نظر ڈرینگ ٹیبل پر پرفیوم کی شیشی کے نیچے پڑی سفید چٹ پر پڑی۔
اُسکے اندر سے آواز آئی تھی جس کے مطابق وہ سفید چٹ خطرناک تھی۔
اس پر مختصر سی تحریر درج تھی۔

”زبردستی اور غلط فہمی کی بنیاد پر قائم ہونے والے رشتے تا عمر نہیں چل سکتے۔ کم از کم میں اس قدر تھرڈ کلاس
تعلق کو قائم نہیں رکھ سکتی ہوں۔ اسلیے جہاں سے آئی تھی، وہیں جا رہی ہوں۔ میرے پیچھے مت آنا۔۔۔۔۔“
دماغ میں غصے کی ایک شدید لہر اٹھی تھی۔ اُس نے کمرے کی ہر چیز اٹھا کر یہاں وہاں پھینک دی۔ اس قدر
توہین کا تو اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

چیزوں کے ٹوٹنے کی آوازوں پر خدیجہ اور ملیحہ بھاگتی ہوئی آئیں۔ آگے کمرے کا حشر دیکھ کر دل تھام لیے۔
کمرے کے وسط میں وہ سُرخ آنکھیں لیے کھڑا تھا۔ ماں کو دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔۔۔۔۔
”میں نے مرد ہوتے ہوئے بھی اپنی انا اور غصہ ایک طرف رکھ کر اسکو عزت دی۔ محبت دی۔۔۔۔۔ رشتے کا
نقدس نبھایا اور وہ مجھے چھوڑ کر واپس اُنکے پاس چلی گئی ہے جنہوں نے اُسکو دو کوڑی کا کر کے اپنے گھر سے نکالا
تھا۔ جب یہ جا رہی تھی آپ نے مجھے تب فون کر کے کیوں نہیں بتایا۔ میں خود جا کر اُسکو دفع کر آتا۔“
غصے کی حالت میں جو جو اُسکے منہ میں آتا گیا وہ بولتا چلا گیا اور دوسرے افراد خاموشی سے سنتے رہے۔ کسی
کے بس میں کچھ ہوتا تب بات اور ہوتی۔ خدیجہ کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ اُنکے لیے میسم کو اس حالت میں دیکھنا
آسان نہ تھا۔ مگر اُسکے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

پہر ختم ہو گئے۔ یونیورسٹی چھوٹ گئی۔ طلال کے کہنے پر اُس نے اُنکے ساتھ، اُنکی ایڈورٹائزنگ ایجنسی
سنبھال لی۔ ذہنی کشمکش سے نپٹنے کے لیے اُس نے خود کو مصروف کر لیا۔ دوستوں سے دوری ہو گئی سوائے ایک
فیصل کے جو کہ اپنے نام کا ایک ہی ڈھیٹ تھا۔ میسم نے اُسکے ساتھ بھی سرد مہری برتی مگر وہ پیچھے نہیں ہٹا۔ حالانکہ
میسم ہر بات کے جواب میں اُسکو کاٹ کھانے کو دور تا تھا۔ فیصل ہی کیا وہ تو ہر انسان سے ناراض ہو گیا تھا۔

خود اپنے آپ سے، وہ سب سے زیادہ خفا تھا۔

آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا کیونکہ ہر دفعہ اپنے آپ سے نظر ملنے پر وہ خود سے یہی ایک سوال پوچھتا۔۔۔

”کیوں اُسکو ایک دم سے خاک سے اٹھا کر عرش پہ بیٹھا دیا؟ کیوں زباب عالم کے لیے بلا جھجک دل کے دروازے واہ کئے؟ وہ آئی۔۔۔ آتے ہی چھا گئی۔۔۔ اور اپنے پیچھے کبھی نہ ختم ہونے والا خلا چھوڑ کر غائب ہو گئی۔ اُس نے گھر میں اس حوالے سے بات کرنا بند کر دی کیونکہ اس طرح وہ جتنا چاہتا تھا کہ اُسے بھی کوئی پرواہ نہیں ہے مگر راتوں کو سونہ پاتا تھا۔ اپنے پہلو میں دل وہی نرم خوشبو بھرے وجود کا لمس ڈھونڈتا جواب وہاں نہیں تھا۔

تنگ آکر اُس نے اپنا کمرہ چھوڑ دیا اور نیچے گیسٹ روم میں شفٹ ہو گیا۔

مگر اُس کے اور زباب کے کمرے کی ہر چیز ویسی کی ویسی ہی پڑی رہی۔ کسی نے نہیں پوچھا اپنے کمرے میں کیوں نہیں سوتے ہو یا پہلے کی طرح ہنسنا بولنا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ اسکی مضبوطی کی دیوار کتنی کمزور تھی۔ ماں باپ کو تب اندازہ ہوا جب اُسکو موسمی تبدیلی کی وجہ سے بخار نے آن لیا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں ماں سے ایک ہی تقاضہ کرتا رہا۔

وہ چاہتا تھا۔ خدیجہ کسی بھی طرح اُسکی زباب کے ساتھ ایک ملاقات کروادیں۔ یہی بات اُس نے ہوش میں آنے کے بعد خدیجہ سے کہی مگر وہ اگر اپنی جگہ مجبور نہ ہوتیں تو بیٹے کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی نہ رہتیں۔ اگر ایک طرف میسم تھا تو دوسری جانب میسم کی اولاد۔۔۔

وقت پہلے کبھی کسی کے انتظار میں رُکا ہے جواب رُکتا۔ وہ اُسی طرح بھاگتا رہا۔ گزرتے لمحوں پر اپنے نشانات چھوڑتا ہوا۔ اپنی دھن میں مست من موجی۔۔۔۔

اس دوران وہ شاید سمجھوتا کر چکا تھا اور زباب کے پیچھے نہ جانے کی تو اُس نے خود سے قسم کھائی ہوئی تھی۔ یہ الگ بات کہ ہر رات تنہائی میں بیٹھ کر سونے سے پہلے وہ اپنے فون پر سکا ئپ، فیس بک، ٹویٹر، انسٹاگرام، ہر جگہ سرچ انجن میں زباب عالم لکھتا اور گھنٹوں بیت جاتے ایک آئی ڈی سے دوسری آئی ڈی چھانتے مگر آج تک کامیابی نہیں ہوئی۔

اُس نے رُباب کی کلاس فیلوز کی آئی ڈیز کے ذریعے میوچل فرینڈز میں ڈھونڈا۔ وہاں جوںک ملا اُسکی لاسٹ اپ ڈیٹ پوسٹ دو سال پرانی تھی۔ اُس نے اپنی آفس کی پروفائل سے وہاں میسج بھیجا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ یہاں تک کہ اُس نے رُباب کے بھائی کی ساری پروفائل کا وقتاً فوقتاً پوسٹ مارٹم کر دیکھا۔ اس سارے عمل کے نتیجے میں ایک سال کے عرصے میں اُس نے دو موبائل فون اور ایک عدد لیپ ٹاپ توڑا تھا۔

روز کہتا ہوں کہ بھول جاؤں اُسے

روزیہ بات بھول جاتا ہوں

ملیجہ کا بڑا اچھا رشتہ آگیا تھا۔ خدیجہ اور طلال نے اسکی ذمہ داری لگائی۔ لڑکے کے بارے میں چھان بین کرے جو کہ اس نے کی اور اسکی طرف سے ہری جھنڈی دیکھاتے ہی دوسری جانب ہاں کہہ دی گئی۔ پر ابھی دونوں طرف سے کوئی تقریب نہیں کی گئی تھی کیونکہ لڑکا لڑکی دونوں ہی پڑھ رہے تھے۔ دونوں کے پیپروں کے بعد کوئی فنکشن رکھنے کا پروگرام تھا مگر چیزیں اگر ہمیشہ انسانی تدبیر کے مطابق ہی چلنے لگیں۔ تو کیا ہی بات ہو۔ وہ اچانک ہی بے وقت گھر آگیا تھا۔ نزدیک ہی ایک بینک میں کام تھا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اُس نے سوچا اب گھر کے پاس ہوں۔ کیوں نہ دوپہر کا کھانا کھا کر ہی واپس دفتر جاؤں۔ اسی لیے گاڑی گھر کے باہر ہی روک کر اندر آگیا۔

باہر کا گیٹ نوکرنے کھول دیا۔

اندر آیا تو امی کو ڈھونڈتا ہوا لاؤنج سے اُنکے کمرے کی طرف گیا۔ وہاں بھی نہ ملیں۔ مگر ملیجہ کے کمرے سے آنے والی آوازوں سے اندازہ ہو گیا کہ امی بھی وہیں تھیں۔ ملیجہ کی بات کانوں تک پہنچی تو قدم وہیں ٹھٹھک کر رُک گئے۔

”امی آپ کو بھائی کو بتا تو دینا چاہیے ناں۔۔۔“

”ہاں تا کہ وہ ایک دفعہ پھر میری جان کو آجائے۔“

”تو پھر کب تک چھپا کر رکھیں گی۔۔۔ ماشا اللہ اب تو آپ کا پوتا بھی آگیا ہے۔“

”ہاہ۔۔۔ پوتے کی ماں کسی طرح بات سننے کی طرف آئے تو تب بات بنے۔ میں سمجھتی تھی ایک دفعہ بچہ ہو

جائے گا تو اُسکی سوچ بدل جائے گی۔ اپنی ضد چھوڑ دے گی پر وہ اب بھی اپنی بات پر اُسی طرح قائم ہے۔
تمہارے ابو بتا رہے تھے۔ آفس میں میسج کے نام خلع کا نوٹس آیا تھا اور وہ بھی اپنے نام کا ایک ہے۔ پورا پڑھے
بغیر ہی پھاڑ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔“

”بھابھی کو کم از کم اب تو طلاق کی بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ آپ سمجھائیں ناں اُن کو۔۔۔“
”اپنی طرف سے کوشش ہی تو کر رہی ہوں۔ اب نہ جانے اوپر والے کی کیا مرضی ہے۔“
اب کی بار ملیجہ بولی تو آواز میں محبت تھی۔

”امی ویسے تو بھابھی بھائی کا نام بھی سننے کی روادار نہیں ہیں۔ پر ہریرہ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ سارا وقت سوچتی وہ
بھائی کو ہی رہی ہیں کیونکہ ہریرہ سارا کا سارا بھائی کی کاپی ہے۔ یہاں تک کہ آنکھوں کا رنگ بھی بالکل بھائی
“۔۔۔۔۔“

دروازے کے فریم میں اُبھرتے میسج کے سراپے کو دیکھ کر ملیجہ کی چلتی ہوئی زبان کو بریک لگ گئی۔
وہ بات بدلنے کا سوچ ہی رہی تھی۔ جب بھائی کا چہرہ غور سے دیکھا تو وہ اپنے الفاظ بھول گئی۔
اُسکی حیران نگاہیں بہن سے ماں اور پھر واپس بہن کے چہرے کا چکر کاٹ رہی تھیں۔ وہ چھ فٹ کا صحت
مند جوان لڑکا دماغی طور پر بال کر رہ گیا۔

خدیجہ یا ملیجہ کو پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میسج کی اجڑی سی حالت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی وہ سب سن چکا
ہے۔ وہ دھیمے قدم اٹھاتا آ کر بیڈ کی سائیڈ پر رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر انگلیاں ایک دوسرے
میں پیوست کر لیے۔ ٹانگیں آگے کو پھیلا لیں۔ اس وقت وہ سفید بے داغ شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ گٹھادہ
پیشانی اور ناک کی نوک پر پسینے کے چند قطرے چمک رہے تھے۔
خدیجہ نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کرنا چاہی۔

”اسلام و علیکم چندہ کب آئے ہو؟ اچھا کیا جو اس وقت آ گئے۔ ہم نے بھی ابھی تک دوپہر کا کھانا نہیں
کھایا۔ جاؤ ملیجہ جا کر کھانا لگاؤ۔۔۔۔۔“

”ضرورت نہیں ہے امی۔۔۔۔۔ ان چند پلوں نے میری بھوک پیاس چھین لی ہے۔“

اُسکے انکار کے باوجود ملیجہ ایسے وہاں سے نکلی جیسے قید سے رہائی پائی ہو۔۔۔ اُسے حقیقت میں اس وقت میسم سے ڈر لگ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کیا سلوک کرنے والا تھا۔

میسم نے ملیجہ کے وہاں سے غائب ہونے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اب وہ آگے کو جھک کر بیٹھا۔ دونوں مہنیاں ٹانگوں پر رکھی تھیں۔ ہاتھ اس وقت بھی ایک دوسرے میں بند تھے۔ آنکھوں کی لالی ہر سیکنڈ کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ یک ٹک ماں کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ دوبارہ سے بولا۔۔۔۔

”اس گزرے وقت میں، میں اُس عورت کی وجہ سے جس قسم کی ذہنی کشمکش اور اذیت کا شکار رہا ہوں۔ آپ کو میرے حال کی پل پل خبر رہی ہے نا۔۔۔ میں نے آپ کی منتیں کیں۔ ایک بار، صرف ایک بار مجھے اُسکے روبرو ہونے کا موقع دیں۔ آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ آپ کا اُسکے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے اور آج میرے حواس پر یہ بم پھوڑ دیا۔ میں ایک بچے کا باپ ہوں اور مجھے ہی علم نہیں ہے۔ کیا اُس مغرور گھمنڈی عورت نے مجھے ہی لا علم رکھا یا آپ کو بھی اب بتایا گیا ہے؟“

خدیجہ بیڈ پر سے اٹھ کر اُسکے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھیں۔
اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولنا شروع کیا۔

”اپنی ماں کو غلط مت سمجھنا میسم۔۔۔ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ تمہارے بچے کی صحت اور زندگی کے لیے ہی کیا ہے۔ وہ یہاں رہتی تو ہر وقت سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتی۔ وہ جس رشتے کو ابھی ذہنی طور پر قبول ہی نہیں کر پائی تھی تم اُسی تعلق کو اگلے مقام پر لے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اس بچے کی زندگی چاہتی ہیں تو ماں کو ڈپریشن سے نکالیں۔ ہر وقت کی ادور تھکنگ کی وجہ سے بچے کی گروتھ نارمل نہیں تھی۔ اُسکو اُس ذہنی اسٹیج سے نکالنے کو میں نے تم سے جھوٹ بولا کہ میرا اُس کے ساتھ رابطہ نہیں ہے۔ میرا اُس کے ساتھ ہر پل کا رابطہ رہا ہے۔ بچے کی پیدائش پر بھی میں اُسکے پاس تھی۔“

”امی اُس نے اپنے اوپر مظلومیت کا لیبل لگا کر جو میرا نقصان کیا ہے۔ میں اُس کو معاف نہیں کرنے والا ہوں۔ آپ سے مجھے یہ اُمید نہیں تھی۔ میں اُسکی زندگی کا ایک غیر اہم فضول انسان ہوں۔ آپ کا تو بیٹا ہوں۔ پھر بھی آپ نے مجھے یہ چوٹ دے دی۔ میرا بچہ اُسکے پاس تھا۔ وہ بے ایمان عورت یہ گیم تو با اصول طریقے سے کھیلتی۔“

مجھے بتایا ہی نہیں۔ بہت ہو گیا، بڑی کر لی اُس نے اپنی من مانی۔۔۔۔۔ اب اور نہیں۔۔۔۔۔“

اتنا کہہ کر وہ باہر کو نکل آیا۔ پیچھے ماں آوازیں دیتی رہ گئیں۔ اُسکے پیچھے گیٹ تک آئیں تھیں۔ مگر اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

گاڑی سٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے وہ آج اُن رستوں پر جانے کو تیار ہو چکا تھا۔ جہاں نہ جانے کی اُس نے قسم کھائی ہوئی تھی۔ مگر آج خود ہی اپنی قسم توڑ رہا تھا۔ اور صرف اور صرف اپنے بیٹے کی وجہ سے۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

آج ملک عالم حیات کی حویلی کی بجائے گھر کے سامنے اپنی گاڑی روکتے ہوئے اُس نے ہارن پر ہاتھ رکھا اور تب تک رکھے رکھا جب تک دوسری جانب سے گیٹ کھل نہ گیا۔

وہ گیٹ کھولنے والے کو گھورتے ہوئے گاڑی کو ریس دیکر اندر لایا۔

سامنے والا اُسکو پہچان گیا تھا۔ اسی لیے آنکھوں میں حیرت اُبھری۔

گاڑی کے زکے ہی وہ تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ کی جانب آیا۔

”کسی گھر آئے ڈنٹن سے بھی یہ سوال کرنا انتہائی بداخلاقی ہے۔ مگر پھر بھی پوچھنے پر مجبور ہوں۔ کیا چیز آپ کو

یہاں لائی ہے؟“

”میں تمہارے منہ لگنے کے لیے ہر گز نہیں آیا ہوں۔ اندر جا کر اپنی بہن کو بولو میرا بچہ میرے حوالے کرے۔

اُسکے بعد میری طرف سے تم سب کے سب بھاڑ میاں جاؤ۔۔۔۔۔“

ملک عبداللہ کے ماتھے پر تیوری آئی۔ تعجب سے اپنے بہنوئی کے ناک پر چمکتے غصے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”میسر ملال صاحب میری صرف ایک ہی بہن ہے جو کہ آپکی بیوی ہے اور وہ آخری دفعہ اس گھر کی دہلیز

سے آپ کے ہمراہ نکلی تھی۔ آج تک کبھی واپس نہیں آئی۔ اس لیے میں آپکا مطالبہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔“

”میں جانتا ہوں۔ تم لوگ ذرا موٹی عقل والے طبقے سے تعلق رکھتے ہو۔ سیدھی سی بات بھی سمجھ نہیں آتی۔

پھر سے آسان لفظوں میں کہتا ہوں۔ یہ لاعلمی کا چولا اتار کر اندر اپنی بہن سے میرا بیٹا لا کر میرے حوالے کر دو۔۔۔

بس۔۔۔۔۔“

ملک عبداللہ کو غصہ تو بڑا آیا مگر پی گیا۔ میسم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ دل میں شکر بھی کر رہا تھا۔ کہ اس وقت ملک عالم حیات گھر پر نہیں تھے۔ ورنہ یوں میسم کو دیکھ کر نہ جانے کیا ردِ عمل دیکھاتے۔

میسم غصے سے لب بھینچے متوازی قدم اٹھاتا اُسکے پیچھے چل رہا تھا۔ جب ملک عبداللہ ایک دروازے پر دستک دیکر اندر داخل ہوا۔

”اماں آپ سو تو نہیں رہی ہیں؟“

”نہیں پتر میری آنکھوں میں تو نیند راتوں کو نہیں آتی۔ ابھی تو پھر دن کا وقت ہے۔“

نبیلہ بیگم کی نظریں اپنے شیر جوان بیٹے سے ہوتی ہوئیں جو نبی میسم پر پڑیں تو پلٹا بھول گئیں۔ آخری بار انہوں نے اُسکو دھندلے سے اندھیرے میں دیکھا تھا۔ جب اُسکے چہرے پر سو جن تھی۔ ایک آنکھ تشدد کی وجہ سے کالی ہو رہی تھی۔ مگر اُسکے قد کاٹھ اور نقوش کو فوراً پہچان کر بیڈ سے اتریں اور اُسکے قریب آئیں۔ دونوں ہاتھوں میں نرمی سے اُسکا چہرہ بھرا۔۔۔

”تم میسم ہوناں؟“

”جی۔۔۔“

بھرائی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے نبیلہ نے اُسکا سر نیچے کر کے ماتھے پر پیار دیا۔

وہ آنکھیں گھما کر رہ گیا۔ ڈرامے باز لوگ۔۔۔!!۔۔۔

”ماں صدقے آج کیسے ادھر کا راستہ بھول گئے۔ کیا وہ بھی تمہارے ساتھ آئی ہے؟“

پوچھنے کے ساتھ ہی انہوں نے دروازے سے منہ نکال کر باہر دیکھا۔ ویران پڑی راہداری دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ واپس اُسکی جانب توجہ ہوئیں۔

”اُسکو بھی اپنے ساتھ لے آتے۔ میری تو آنکھیں ترس گئیں ہیں۔ ماں باپ سے غلطی ہو جائے تو اولاد کو

بھی ایسے بدلاینے تو نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ آخر کو ماں باپ بھی انسان ہی تو ہیں۔“

”وہ میرے گھر پر نہیں رہتی ہے۔ میں یہاں آپ کو ملنے نہیں آیا ہوں۔ بلکہ اپنے بیٹے کو لینے آیا ہوں۔ پلیز

اگر آپ یہ سب کہہ کر مجھے یہ یقین دلوانا چاہتی ہیں کہ آپ کی بیٹی ادھر نہیں ہے تو میں جا کر پولیس کو لے آؤں گا اور اس دفعہ بات میری نہیں ہے، میرے بیٹے کی ہے۔ آپ کی دولت بھی آپ کے ظلم چھپانے کے کام نہیں آئے گی۔ اس لیے سیدھے سے اپنی بیٹی کو بلوائیں۔“

عبداللہ اکتا کرو انچی آواز میں بولا۔

”وہ ادھر نہیں ہے۔ کوئی زبان سمجھ آتی ہے آپ کو۔ بتادیں میں اُس زبان میں ترجمہ کر کے بتا دیتا ہوں۔ آپ کی بیوی ادھر نہیں ہے اور یہ بیٹے والی تو بات تو ہمارے لیے نئی خبر ہے۔ مبارک ہو۔۔۔“

”اگر وہ ادھر نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟ کیونکہ شادی کے ایک ماہ بعد وہ میرا گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میں تو آج تک یہی سمجھتا آیا ہوں کہ وہ ادھر آگئی ہے۔“ عبداللہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ نبیلہ بھی بیڈ کی پائنتی پر گری گئیں۔

”آپ کہنا چاہ رہے ہو۔ وہ پچھلے بارہ ماہ سے لاپتا ہے؟ اور آپ نے ہمیں بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔“

”جانے دو ملک عبداللہ۔۔۔ کم از کم میرے سامنے زبان کھولنے سے پہلے دس دفعہ سوچنا۔ یاد کروادوں کہ میں وہی میسم طلال ہوں۔ جس کے ساتھ ذبردستی تم نے اپنی بہن کا نکاح اُسکی مرضی کے خلاف پڑھوایا تھا۔ اس لیے اب میرے سامنے یہ ظاہر نہ کرنا کہ تمہیں اُسکی بڑی پرواہ ہے۔ ورنہ اپنا سارا غصہ تم پر ہی نکال دوں گا۔“

پھر وہ نبیلہ کے سامنے فرش پر پیروں کے بل بیٹھا اور انکا ہاتھ اپنی گرفت میں لیا۔

”آپ سے براہِ راست یہ میری پہلی ملاقات ہے۔ آپ نے میری ماں کی طرح میری پیشانی چومی ہے۔ اس لیے آپ کو ماں ہی کی طرح عزت دینے پر مجبور ہوں۔ وہ لاپتا نہیں ہے۔ ہاں مجھ سے چھپ کر کہیں رہ رہی ہے۔ میرے گھر والوں سے رابطے میں ہے۔ میری امی اُسکو مجھ سے بھی زیادہ چاہتی ہیں۔ اس لیے بے فکر رہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے۔ بالکل محفوظ ہے۔ میں جلد اُس تک پہنچ جاؤں گا اور ہاں آپ کا اب ایک عدد نواسہ بھی ہے۔ کیسا ہے؟ میں نہیں جانتا ہوں۔ کیونکہ آپ کی بیٹی نے مجھے اُسکی پیدائش سے لاعلم رکھا ہے۔ یہ تو آج بائے چانس میں نے اپنی امی اور بہن کو باتیں کرتے سنا ہے۔ اُنکی باتوں سے تو یہی معلوم ہوا ہے کہ اُسکا نام ہریرہ ہے اور وہ

میری طرح دکھتا ہے۔ میری طرف سے مبارک قبول کریں۔ اگلی دفعہ مٹھائی لیکر آؤں گا۔ ابھی اجازت۔۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔۔“

نبیلہ کو مسکراتا ہوا چھوڑ کر وہ ملک عبداللہ کو نظر انداز کرتا وہاں سے آ گیا۔

☆.....☆.....☆

پنجاب یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں شام اُتری ہوئی تھی۔ پُرسکون ماحول میں درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے جھنڈ کے جھنڈ آ کر ایک دوسرے سے ملتے ہوئے اپنی سارے دن کی آپ بیتی سنارہے تھے۔ موج مستی تھی۔ بے فکری تھی اور سب سے بڑھ کر سکون تھا۔ رگوں میں اتر کر سیراب کرنے والا سکون اور روح کو بے چین کرنے والا اضطراب آج کل میسم طلال کی رگ رگ میں بھرا ہوا تھا۔ وہ کل سے گھر نہیں گیا تھا۔ کل کی رات فیصل کے گھر گزارنے کے بعد صبح اسے بھی بتائے بغیر آوارہ گردی کو نکل گیا تھا۔ وہاں سے مایوس ہو کر وہ سیدھا فیصل کے پاس آیا۔ جو شام کی کلاس لینے کے بعد فارغ ہوا تھا۔ کافی دن بعد وہ لوگ آ کر یہاں بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام کے سائے لمبے سے لمبے ہو گئے۔ ادھر ہی کھانا منگوا کر کھایا۔

فیصل اس وقت سگریٹ کے کش پہ کش لیتے ہوئے اپنے انداز میں کھانا ہضم کرنے میں مصروف تھا۔ جبکہ وہ بیچ پرچٹ لیٹ کر لالی بکھرے آسمان کو دیکھ دیکھ کر اور بھی اُداس ہو رہا تھا۔۔۔۔
”ویسے ایک بات تو ہے۔۔۔۔“

اپنے سے چند قدم کی دوری پہ گھاس پر بیٹھے فیصل کی بات کو لا پرواہی سے سنتے ہوئے اُس نے پوچھا۔
”وہ کیا۔۔؟“

”یار اس ایک سال نے مجھے گدھے سے انسان بنایا اور اب باپ بنا دیا۔ تو مان یا نہ مان یہ سال تیرے لیے بڑا الکی گیا ہے۔“

”اگر تو یہ بیہودہ انداز اپنا کر مجھے تسلی دینا چاہ رہے ہے تو اپنے الفاظ جمع خاطر رکھو۔ میں باپ تو بنا ہوں۔ پر دنیا کا شاید بد قسمت ترین باپ ہوں جس سے اسی کے بچے کو مچھپایا گیا ہے۔ بات کرتے کرتے بے چینی سے اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”یار میں کوئی آدم خور ہوں؟۔۔ وہ مجھے سمجھی کیا ہے؟۔۔ کیا میرا قصور یہ ہے کہ میں نے کھلے دل اور نیک نیتی سے اُسے قبول کیا تھا۔ جواب میں اُس نے کیا کیا ہے؟ میرا دل کرتا ہے۔ ایک دفعہ وہ میرے سامنے آجائے۔ اُسکا حشر کر دوں گا۔“

”چل رہے دے پاپے اتنا غصہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اگر امی کہہ رہی ہیں کہ سب کچھ بچے کی صحت کے لیے کیا ہے۔ تو تم بھی تھوڑا ظرف دیکھاؤ۔“

”ظرف دیکھاؤں؟؟ وہ طلاق چاہتی ہے۔ ظرف دیکھانے کا مطلب تو یہی ہے نا کہ اُسکے مطالبے پر طلاق دے دوں اور بچے کو لینا تو دور کی بات، ملنے تک کا مطالبہ نہ کروں؟“

”اللہ نہ کرے تم دونوں کی کبھی طلاق ہو۔ اللہ حیاتی دے انشا اللہ بھابھی ایک دن آجائیں گی۔ اصل میں اُنکے ساتھ ہوا بھی تو بہت بُرا تھا۔ ٹھیک ہے تو میرا جگر سہی پر یہ بھی تو دیکھ تیری ایک سوا ایک لڑکیوں کے ساتھ پیلو ہائے اور دوسری طرف بھابھی وہ لڑکی ہیں جن کی عزت یونیورسٹی کا ہر لڑکا کرتا ہوگا۔ انتہائی سلجھی ہوئی۔ پھر اچانک سے جو کچھ ہوا۔ انسان کو سنہلنے کے لیے تھوڑا وقت چاہیے ہوتا ہے۔“

”ہاں انسان تو ایک وہی ہے۔ میں تو کسی بھوت پریت برادری کا بندہ ہوں۔“

”یار بتایا تو ہے۔ تم پہلے گدھے تھے۔ اب ماشا اللہ سے انسان ہو۔ کیا روٹین ہے۔ شرافت کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑے ہوئے ہیں۔ بچہ صبح ابوجی کے ساتھ آفس جاتا ہے۔ رات کو ناک کی سیدھ پر گھر آتا ہے۔ نمازوں کے بعد یہ لمبی لمبی ڈعائیں مانگی جاتی ہیں۔ زلفوں کا جنگل کاٹ دیا ہے۔ غیر ضروری عادتیں چھوڑ دی ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ بھلا ہو بھابھی کا جو تم سے دور گئیں۔ ورنہ تم تو انتہائی شوخ انسان تھے۔ مانگ مانگ کر تم سے لڑکیوں کے نمبر نکلوانے پڑتے تھے۔ جب سے تم نے یونیورسٹی چھوڑی ہے۔ لڑکیاں سیدھی تیرے بھائی کے پاس آتی ہیں۔ فیصل صاحب یہ میرا نمبر کسی طرح میسم تک پہنچا دیں۔ اُسے کہنا کال ضرور کرے۔“

خراب موڈ کے باوجود میسم کا قبضہ بے اختیار تھا۔

”ڈوب مر سالے میں نے میدان چھوڑ دیا۔ پھر بھی تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

”بس یار تیرا دوست ایک دفعہ کڑوڑ پتی بن جائے۔ پھر دیکھنا لڑکیاں ہی لڑکیاں۔۔۔ ابھی تو اپنی جیب میں

خود کے لیے فلم کا ٹکٹ خریدنے کا مال نہیں ہوتا۔ لڑکیوں کو سیر سپاٹا کہاں سے کرواؤں گا۔ اب ہر کوئی تجھ بے غیرت سا خوش نصیب تو نہیں ہوتا نا۔۔۔ باپ مالدار۔۔۔ گاڑی اپنی ملی ہوئی ہے۔ جیب میں کھلا خرچہ، لڑکیوں کی ساگرہ پر ہزاروں کے تحفے دیتے ہو۔ اسی وجہ سے تمہاری ویلیو ہے۔ ورنہ شکل تو تیری نری کدو جیسی ہے۔ اپنے بھائی جیسی گڈ لکس کا سرے سے فقدان ہے۔“

”ہاں جی بالکل بجا فرما رہے ہو۔ اب تو مجھے بھی یقین ہو گیا ہے۔ میری شکل ہی بد صورت ہے۔ اسی لیے وہ میرے ساتھ رہ نہیں پائی۔“

”دھت تیری۔۔۔ گھوم پھر کر سوئی اُدھر ہی آ کر نکلتی ہے۔ تم بھول کیوں نہیں جاتے۔۔۔“

”کیا بھول جاؤں؟ یہ کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے اور وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی ہے۔“

فیصل اٹھ کھڑا ہوا اور میسم کا بازو کھینچ کر اُسے بھی کھڑا کیا۔

”چل اٹھ چلیں۔۔۔ اندھیرا پھیل گیا ہے۔ گھر پر امی پریشان ہوں گی۔ کل کا کھلا ہوا ہے۔ چل کر اُنکو بولتے ہیں۔ یا تو بھابھی کا پتا بتائیں یا اُنکو لیکر آئیں۔ میں اپنے ہونہار کو ایسے نہیں دیکھ سکتا۔ ذنیا کے دوسرے کونے سے بھی بھابھی کو جا کر لانا پڑا تو اپنے جگر کی خاطر یہ بھی کر جاؤں گا۔ بس تو مجھے سحرش کا نمبر لے دے۔“

”پرے مر۔۔۔ اُسکی منگنی ہو گئی ہے۔“

”منگنی ہی ہوئی ہے۔ کونسا شادی ہوئی ہے۔“

”اچھا یہ بات ہے تو بیٹا اُسکے پانچ بھائی پہلوان ہیں۔ چھٹا والا پولیس میں ہے۔ گھر کا پتہ میں دے دیتا ہوں۔ جانے سے پہلے اپنی ماں کے نام خط لکھ دینا۔“

دونوں گراؤنڈ سے نکل کر مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے پارکنگ کی جانب جا رہے تھے۔ فیصل کی مری ہوئی سی آواز نکلی۔۔۔

”یار میسم یہ محبت کے ساتھ بھی لکھا ہونا چاہیے۔ خبردار مضر صحت ہے۔ بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔“

میسم کو بڑی ہنسی آئی۔۔۔

”بس ہوا نکل گئی ہے۔۔۔؟“

”یار گولی مار ہوا کو۔ زندہ ہی نہ رہا تو محبت کیا خاک کرونگا۔ ویسے بھی کل میں نے لڑکوں کے ہاتھ روم میں ایک لائن لکھی دیکھی ہے۔ کسی نے لکھا ہے۔ سچا عشق وہی ہے۔ جو ملتا نہیں ہے۔“

”واہ جی واہ آپکی محبت ایک ہی جست میں عشق بن گئی۔“

”بس یار جب لڑکی کے اتنے خطرناک بھائی ہوں تو اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ لے دے کر ایک عشق کا چانس ہی لیا جاسکتا ہے۔“

میمم دل کھول کر ہنس رہا تھا۔ جب کہ فیصل نے جلے دل کے ساتھ شرم دلوانی چاہی۔

”بس جی سچ کہا ہے کسی کہنے والے نے کہ چڑیاں دی موت گنوار ادا ہا سا۔۔۔۔“

”چڑی کون ہے؟ تم یا تمہاری محبت۔۔۔؟“

”یہ بات راز میں ہی رہنے دو۔ آج اس گانے کے بول ضرور سمجھ میں آ گئے ہیں۔۔۔۔“

میمم نے گاڑی پارکنگ سے نکالتے ہوئے پوچھا۔ ”کون سے گانے کے؟“

”وہی جو ہمارا میتھ کا پروفیسر گایا کرتا تھا۔“

بتانے کے بعد فیصل اونچی آواز میں سر کے ساتھ ٹکٹانے لگا۔۔۔۔

”تو نے اپنا بتا کر نظر پھیر لی۔۔۔۔۔“

میرے دل کا سکون نہ رہاٹ گیا۔۔۔۔۔“

میمم نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”بس بس اس سے زیادہ اس کلام کی بے حرمتی نہ کر۔ میرے پاس ہے۔ میں سٹریو پہ لگا دیتا ہوں۔۔۔۔“

دو منٹ بعد گاڑی گھر کو جا رہی تھی۔ مولوی حیدر حسین کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی اپنی پھٹیچر آواز سمیت فُل والیوم میں گارہے تھے۔

تو نے اپنا بتا کر نظر پھیر لی

میرے دل کا سکون نہ رہاٹ گیا

مجھ کو لوٹا تیرے عشق نے جانے جاں۔۔۔

میں تیرے عشق میں جانے جاں لٹ گیا۔۔۔۔

چند دن کہ فقط میری جاگیر تھے

وہ بھی باؤخزاں لوٹ کر لے گئی

میں نے دیکھا نہ فصل بہاری کا منہ

میں قفس میں رہا آشیاں لٹ گیا

میں نے لٹنے سے پہلے یہ سوچا کہ میں

راز کی بات ہی دل سے کہہ رہا ہوں

راز کی بات تو رہ گئی راز میں

مجھ سے پہلے میرا راز ڈالٹ گیا

دل میرا عشق بازی میں انجان تھا

آگیا اک ذرخ بے وفا پر یونہی

دل نے سوچا نہ سمجھا نہ پہچان کی

اس نے لٹنا کہاں تھا کہاں لٹ گیا۔۔

☆.....☆.....☆

”آپ اُسکے ساتھ بات کیوں نہیں کرتے؟ پرسوں دوپہر کا وہ گھر سے نکلا آج واپس آ رہا ہے۔ کھانا پوچھا تو

اس کے لیے بھی نہ بول دی ہے۔ آخر کیوں مجھے پریشان کر رہا ہے۔“

”وہ کوئی بچہ تو نہیں ہے۔ جب کہہ رہا ہے کہ باہر سے کھا آیا ہے تو یقین کر لو۔ آخر فیصل نے بھی تو یہی کہا تھا

۔۔۔“

”اچھا میں ہی یقین کر لیتی ہوں۔ آپ اس موئے ٹی وی کے آگے سے نہ اٹھیے گا۔ اپنے گھر میں اتنے

مسائل بکھرے ہوئے ہیں اور محترم کو ہر وقت دنیا کی پڑی رہتی ہے۔“

”کوئے مسائل بھی۔۔۔۔۔ صاحبزادے کو اُسکی بیوی کا پتہ بتادو۔ خود ہی سب مسائل ختم ہو جائیں گے۔“

”ہاں پتہ بتادوں تاکہ وہاں کسی دوسرے شہر میں رشتے داروں کے سامنے یہ لوگ خانہ جنگی کھول کر بیٹھ جائیں۔ جس کاں تک ابھی سارے معاملے کی خبر نہیں پہنچی اُسکو بھی اطلاع ہو جائے۔“

”چلو پھر انتظار کرو اُس وقت کا جب تمہارا بیٹا تم سے مخاطب ہونا بند کر دے گا اور یہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔“

”اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ میرا ایک ہی ایک تو بیٹا ہے۔“

”تو پھر اُسکی خوشی پوری کر دو۔۔۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں۔ جیسے اپنی بہو سے واقف نہیں ہیں۔“

”میں اگر بہو سے واقف ہوں تو بیٹے سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ آفس میں بعض اوقات جو مشکل پراجیکٹ آجاتے ہیں۔ اُس پر انہیں پرفیکٹ بنانے کا جنون سوار ہو جاتا ہے۔ ابھی بھی وہ بے چین اسی لیے ہے۔ کیونکہ ہم لوگوں نے اُسکو اُسکا اپنا کیس اُسکے اپنے انداز میں حل کرنے کی مہلت نہیں دی ہے۔ بلکہ اُسکو پٹ کی طرح انگلیوں پر نچایا ہے۔ حتیٰ کہ بچے کی پیدائش بھی چھپا دی۔ اب بہتری اسی میں ہے۔ اپنی بہو کو کسی طرح ایک دفعہ گھر بلا لو۔ پہلے بچے کی وجہ سے احتیاط تھی۔ اب اللہ کے فضل سے میرا شہزادہ ٹھیک ٹھاک دنیا میں آچکا ہے تو باپ سے کیوں نہ ملے۔“

”وہ نہیں مانے گی۔“

”تم کوئی بہانہ سوچو۔۔۔ ماں ہو آخرا یہوشنلی ٹریپ کرو۔۔۔ آخر بیٹے کو بھی تو کرتی رہی ہو۔“

”ٹھیک ہے میں کوشش کر دیکھتی ہوں۔ اگر وہ کسی طرح بھی باتوں میں نہ آئی تو؟“

”تو میسم کو بتا دینا کہ وہ کدھر رہ رہی ہے۔“

”اللہ کرے وہ میری بات مان جائے۔“

”امین۔۔۔ کیا اب مجھے خبریں سننے کی اجازت ہے؟“

”جی نہیں سنیں آخر رات کو نیند کیسے آئے گی۔“

”بڑی نوازش ہے۔ بس ایک گلاس پانی دیتی جائیں۔“

خدیجہ نے پانی کا گلاس لا کر شوہر کو دیا اور خود عشاء کی نماز پڑھنے کے لیے وضو کرنے چلی گئیں۔ ذہن ساری صورتحال کا کوئی حل سوچنے میں مصروف عمل تھا۔

☆.....☆.....☆

ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ جس کے آثار ہر طرف نظر آرہے تھے۔ اولڈ ہوم کے دلکش لان میں آج ہر جانب خشک آوارہ پتوں کا ڈھیر تھا۔ ابھی تک سارا آسمان بادلوں نے گھیرا ہوا تھا۔ گہرا گرے رنگ کسی بھی وقت پھٹکنے کو تیار لگ رہا تھا۔

اپنی روزمرہ کی روٹین کے مطابق آج بھی اُس نے شاف کے لیے بنے لاؤنج میں نماز پڑھی۔ جہاں کمرے کے فرش پر کارپٹ ڈالا گیا ہوا تھا۔ ایک کونے میں لمبی سی کوئی بارہ گریسوں والی میز لگی تھی۔ اور کمرے کے چاروں اطراف دیواروں میں الماریاں تھیں۔ جن میں سارا ریکارڈ جمع پڑا تھا۔ یہی کمرہ نماز کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اسکے علاوہ اسٹاف کی میٹنگز وغیرہ بھی یہیں ہوتی تھیں۔

نماز پڑھتے ہی اُسکی عادت تھی۔ قرآن ہاتھ میں لیکر لان میں نکل جاتی اور وہاں بنے سگی بیچ پر بیٹھ کر ناشتہ لگ جانے تک سبق پڑھتی۔ جب ملازم ناشتے کا بتا کر جاتا۔ وہ اگلے دس منٹ میں تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچ جاتی۔ ہریرہ کی رات دیر سے سونے کی عادت کا اُسکو یہ ایک بڑا فائدہ تھا۔ دن میں وہ دس بجے سے پہلے نہیں اٹھتا تھا۔ اُس وقت وہ خود تو دفتر میں ہوتی تھی۔ ملازمہ بچے کو نہادھلا کر ناشتہ کروانے کے بعد اُس کے حوالے کر جاتی تھی۔ جہاں وہ لنچ تک اُسکو اپنے ساتھ رکھتی۔ اُس کے بعد دوبارہ ملازمہ کی گود میں چلا جاتا۔ وہ ناشتے کے بعد سیدھی آفس میں جاتی اور سارا دن ادھر مصروف گزار کر چار بجے آفس بند کر کے واپس رہائشی حصے کی جانب آ جاتی۔

پچھلے بارہ ماہ سے اُسکا یہی معمول رہا تھا۔ جس میں اب آکر اُس نے تھوڑی تبدیلی یہ کی تھی کہ اوپن یونیورسٹی کے ذریعے ایک کورس شروع کر لیا تھا۔ جس نے شام کے بعد بھی مصروف کر دیا تھا مگر سب سے بڑی تبدیلی تو اس ننھی جان کی وجہ سے آئی تھی۔ جو بڑے وقت پر سونے والی ماں کو اب آدمی آدمی رات تک سونے نہ دیتا تھا۔ اپنی زبان میں غموں غاں کر کر کے نہ جانے کیا کہانیاں سناتا تھا۔

بیچ پر بیٹھ کر سبق پڑھنے کا اس وقت تو خاص ہی سرور آ رہا تھا۔

احاطے کی دیوار کے ساتھ لگے پاپولر اور سفیدے کے درخت ہوا کے جوش پر اپنے ہی انداز میں جھوم رہے تھے۔ موئیے کے تین پودے تھیاور تینوں ہی پھولوں سے بھرے ہوئے تھے۔ جن میں سے آدھے پھول ٹوٹ کر ہری گھاس پر دور دور تک ہوا کے دوش پر اڑ کر گرے ہوئے تھے مگر انکی خوشبو نے سارے ماحول کو قابو کیا ہوا تھا۔ وہ سبق پڑھتے پڑھتے ایک پل کو زکئی، گہرا سانس کھینچتی، زیر لب مسکراتی اور پھر دوبارہ قرآن کھول لیتی۔ اس وقت بھی وہ سورۃ الملک کی تلاوت کرنے میں مگن تھی۔ جب ملازم نے اطلاع دی۔

”میڈم جی آپکے لیے لاہور سے فون آیا ہے۔“

اُس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی۔ ایسا آج کل اُس کے ساتھ تب ہوتا تھا جب کسی کی زبان سے لاہور کا نام سنتی تھی۔

”تم نے پوچھا کہ کس کا فون ہے؟“

ملازم نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں جی پر کوئی خاتون ہیں۔ خود کو آپ کی والدہ بتاتی ہیں۔“ اُس کے چہرے کے تاثرات یکسر تبدیل ہو گئے۔ آنکھوں میں سے نرمی کا اثر غائب ہو کر سرد مہری میں بدل گیا۔

”آئندہ اگر کوئی خاتون فون پر خود کو میری ماں بتا کر مجھ سے بات کرنے کی خواہش کا ظاہر کرے تو کہہ دینا کہ میرا حکم ہے۔ مجھے ایسی کوئی کال ٹرانسفر نہ کی جائے کیونکہ میری کوئی ماں نہیں ہے۔“

قطعی طور پر کہہ کر وہ واپس اپنے کام میں مگن ہو گئی۔ ملازم لیس میم کہہ کر واپس مڑ گیا۔ مگر دو منٹ بعد پھر آیا۔

”میڈل جی وہ کہہ رہی ہیں۔ اُنکا نام خدیجہ ہے۔“

اب کی بار وہ چوکی تھی۔ کیونکہ خدیجہ آنٹی نے ہمیشہ اپنی بہن کے نمبر پر فون کر کے اُس سے بات کی تھی۔

کچھ پل سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلاتی اُنھ کھڑی ہوئی۔

”میں آرہی ہوں۔ تم جاؤ۔۔۔“

ملازم جی اچھا کہہ کر تیزی سے نکل گیا۔ وہ ہند سوچ انداز میں قدم اٹھاتی اندر کی جانب بڑھ گئی۔
”ہیلو؟“

”اسلام وعلیکم۔۔۔“

”وعلیکم اسلام۔۔۔ آپ کیسی ہیں؟“

اُس کے پوچھنے پر دوسری جانب سے شکوہ آیا۔

”تمہیں کیا لگے۔ تمہاری طرف سے کوئی مرے یا جیے تمہیں کونسا اپنے علاوہ کوئی اور نظر بھی آتا ہے۔“

اُس نے گہرا سانس خارج کیا۔ وہ بڑی نرمی طرح سے اُسکو گھیرنے کے ارادے میں لگ رہی تھیں اور اُس کے پاس سب سے بہتر ہتھیار یہی تھا۔ جو جو وہ کہتیں وہ خاموشی سے سنتی جائے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اصل میں یہاں کام کی مصروفیت ہی اس قدر ہوتی ہے۔ اوپر سے ہریرہ کے کام

کچھ بھی سوچنے، کرنے، کہنے کا وقت نہیں ملتا۔“

”ہاں بس وکیل سے ملنے کا وقت مل جاتا ہے۔“

یعنی وہ نوٹس کے بارے میں جان گئی تھیں مگر وہ تو اُس نے اسی ڈر کی وجہ سے گھر کی بجائے آفس کے پتے پر

بھیجا تھا۔

”آنٹی پودوں کے ساتھ آگ آنے والی اضافی شاخوں اور پتوں کو کاٹ دینا ہی سودمند ہوتا ہے۔ ورنہ

پودے خود مر جھا جاتے ہیں۔ اسی طرح جن رشتوں کی وجہ سے آپ خود اپنے آپ سے بھی نظر نہ ملا پاتے ہوں۔

اُن کو بھی چھوڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔“

”بہت سیانی ہوگئی ہو۔ کیا ایک ماں کے دل سے اولاد کی محبت نکال سکتی ہو؟“

”مگر آپ مجھ پر میری ماں سے بڑھ کر مہربان ہیں۔ میں آپ کی اولاد نہیں ہوں۔“

”یہ تو تمہاری سوچ ہے ناں۔ جس کا مظاہرہ ابھی میں فون کرتے ہی دیکھ چکی ہوں۔ ماں کہا تو تم فون پر ہی

نہیں آئیں۔“

”اُسکی وجہ سے بھی آپ واقف ہیں۔“

”جو تم یہ سب کر رہی ہو، اسکا فائدہ کیا حاصل ہونے والا ہے؟“

”میں نے اپنا فائدہ نقصان کب کا سوچنا چھوڑ دیا ہوا ہے کیونکہ جن باتوں نے مجھے نقصان دیئے اُن میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ جب زندگی میں کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تو کیا فائدہ سوچ سوچ کر مرنے کا۔“

”ملیجہ کی مٹگنی ہے اور میں چاہتی ہوں۔ تم گھر آؤ۔ مجھے میرے بچے سے ملو جاؤ۔۔۔“

”میرا آنا ممکن نہیں ہے۔ آپ ادھر آ کر ہریرہ سے مل جائیں۔“

”کیا تمہارے دل میں میرے لیے اتنی سی جگہ بھی نہیں ہے کہ تم میری بات پر سوچ سمجھ کر جواب دو۔ فٹ سے انکار کر دیا۔ جو کچھ ہوا۔ اُس میں میرا، ملیجہ یا اس کے باپ کا کیا قصور تھا؟ پھر بھی میں نے ہر معاملے میں تمہارا ساتھ دیا۔ صرف میں وہ انسان ہوں جس نے بغیر کسی صفائی کے تمہارا یقین کیا۔ تم نے کہا گھر سے جانا ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کی مخالفت مول لیکر تمہیں جانے دیا۔“

وہ اُنکودر میان میں ہی ٹوک گئی۔۔۔

”آپ کے بیٹے کا میرے پر کوئی حق نہیں ہے۔ میں اُسکی زندگی سے نکل چکی ہوں۔“

”کیا تم واقعی اُس کی زندگی سے نکل چکی ہو؟“

”کچھ عرصے کی بات ہے۔ پھر یہ بھی ہو جائے گا۔“

”میں تمہارے اور اپنے بیٹے کے تعلق پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی ہوں نہ کروں گی۔ بس اتنی سی خواہش ہے۔ تم ملیجہ کی مٹگنی پر موجود ہو۔ یہ بھی بتا دوں کہ جس کی وجہ سے آنا نہیں چاہ رہی ہو، وہ جا پان گیا ہوا ہے۔ گھر پر نہیں ہے۔ اس لیے تمہارا ہونا ضروری بھی ہے۔“

”ملیجہ تو مجھے منع کر رہی تھی۔ اُسکا کہنا ہے۔ تم نے کبھی اُسکے ساتھ فون تک کا رابطہ نہیں رکھا۔ تو اُسکی خاطر گھر کیسے آ سکتی ہو۔“

اُس نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ گئی۔۔۔

”ملیجہ سے کہہ دیں کہ میں ضرور آؤں گی۔ کس دن آنا ہے؟“

دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ چند پل بعد بھرائی ہوئی آواز میں شکریہ بولنے ساتھ تین دن بعد کا وقت بتا

کر لائن کاٹ دی گئی۔ فون واپس رکھ کر تیزی سے وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس لمحے تنہائی کی خواہش شدید تر تھی۔ کمرے کا دروازہ اپنے پیچھے لاک کرنے کے بعد بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ جیسے طویل مسافت کا مسافر تھک کر راستے میں گرتا ہے۔

وہ واپس اُس گھر میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ فیصلہ آج کا نہیں تھا۔ بلکہ جس دن اُس گھر سے قدم نکالا تھا، دل میں اس بات کا پختہ ارادہ رکھتے ہوئے دہلیز پار کی تھی مگر آج وہ اس عورت کو نہ نہیں کر پائی کیونکہ وہ انکی احسان مند تھی اور جن کے آپ قرض دار ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی انکی ناجائز بھی ماننی پڑتی ہے۔ یہ تو پھر ایک بڑا ہی بے ضرر سا مطالبہ تھا۔

اُس نے اٹھ کر بیڈ سائیڈ میز پر رکھا پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔ چند گھونٹ میں گلاس خالی کر کے واپس رکھتے ہی اپنا موبائل اٹھا لیا۔ نمبروں کی لسٹ میں سے ایک جانا پہچانا نمبر ملا کر سیٹ کان سے لگایا۔
چوتھی بیل پر جواب دیا گیا تھا۔
”ہیلو نیٹی۔۔۔؟“

”جی ملکہ عالیہ فرمائیے۔۔۔“

”میں اور ہریرہ لاہور جا رہے ہیں۔ اگر ہو سکے تو ہماری پرسوں کی لاہور کے لیے ٹکٹ کروادو۔“

”ہائیں یہ بیٹھے بیٹھائے لاہور کیوں یاد آ گیا؟“

”مجھے لاہور نہیں یاد آیا۔ لاہور کو میں یاد آئی ہوں۔ بلکہ لاہوریوں کو۔“

”بندی معاملے کی تفصیل چاہتی ہے۔“

”اگر میں بتانا نہ چاہوں تو۔۔۔؟“

”ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ کوشش کر لو اور سیٹ بھی خود ہی کروالینا اور اپنے بوگے شاف کو کنٹرول کرنے کے لیے اپنی اسٹنٹ بھی نئی ڈھونڈ لینا کیونکہ جہاں افسر اور ماتحت کے درمیان اعتماد کا رشتہ ہی نہ ہو لعنت ہے ایسی نوکری پر اور مجھے اس نوکری سے ملنا ہی کیا ہے۔“

”یہ سب بیان بازی کرنے سے پہلے یہ بات یاد رکھو۔ یہ ادارہ میرا نہیں تمہارے والدین کی ملکیت ہے اور

تم میرے لیے کام نہیں کرتی ہو بلکہ اپنے ماں باپ کا کاروبار دیکھ رہی ہو۔ تیسرا یہ کہ مجھے تمہاری طرح اپنی ذاتی زندگی کو اشتہار بنانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ تو میں رہی افسر ماتحت کے اعتماد سے۔۔۔“

”ہاں ہاں جیسے تم نہیں بتاؤ گی تو مجھے پتا ہی نہیں چلنا۔ بھول رہی ہو۔ تو یاد کروادیتی ہوں۔ خدیجہ آنٹی میری سگی خالہ ہیں۔ اور تمہارا۔۔۔۔۔“

لہٰذا کو درمیان میں ہی ٹوکا۔۔۔

”مجھے کچھ بھی نہیں بھولا۔۔۔ پلیز میرا سر کھانے کی بجائے۔ سیٹ کروادو۔“

”وہ تو میں کروا ہی دوں گی۔ بلکہ دو ایک اپنی ایک تمہاری۔۔۔“

”کیا فرحت آنٹی نہیں جا رہی ہیں۔۔۔؟“

”امی کا کوئی پتا نہیں ہے یا۔۔۔ جانا ہوا تو خود ہی دونوں میاں بیوی اپنی سیٹیں کروالیں گے۔ بچے تو نہیں ہیں۔“

”انتہائی بے ادب بیٹی ہو۔“

”مجھے تم بے ادب ہی رہنے دو۔ ادب لحاظ والوں کے ساتھ بھی کونسا اچھی ہوتی ہے۔ اب اپنی طرف ہی دیکھ لو۔“

ہمیشہ کی طرح اُس کی زبان قینچی کی طرح چل چکی تھی اور بعد میں احساس ہونے پر دھیرے سے بولی۔

”تمہیں علم ہے ناں میں منہ پھٹ ہوں۔ اب اگر غصہ کرنا ہے تو کر لو۔۔۔ میرے کونسا فرشتوں کو کوئی اثر ہونا ہے۔ ویسے میرے دماغ میں ایک آئیڈیا ہے۔ اگر تمہیں بُرا نہ لگے تو کہوں۔۔۔؟“

”ہاں جیسے میں کہہ دوں گی کہ مجھے بُرا لگا ہے۔ تو تم اپنی بات کہے بغیر فون بند کر دو گی۔ بولو کیا ہے؟“

”جہاز کے ذریعے لاہور جانے کے آئیڈیا پر پانی پھیر دو۔۔۔ ٹرین کے ذریعے چلتے ہیں۔ بلال کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ سچی راستے میں بڑا مزا آئے گا۔“ لہٰذا کو سوچ کر ہی مزا آ رہا تھا۔ مزید بولی۔ ”ساتھ ہمارے کچھ پیسے بھی بچیں گے۔ اُس سے شاپنگ وغیرہ کر لیں گے۔ آخر ملیجہ کے لیے کوئی گفٹ بھی تو لینا ہوگا۔“

”اُسکی تم فکر نہ کرو۔ میرے اکاؤنٹ میں کافی پیسے جمع ہیں۔۔۔“

”ہاں بھی پچھلے ایک سال سے لگی ہوئی ہو پائی پائی جوڑنے۔ اب تو یہی کہو گی۔ پر میں اتنی امیر نہیں ہوں۔ ابھی پچھلے ہفتے دوست کی سالگرہ پر ساری جمع پونجی لٹا چکی ہوں اور اگلا جیب خرچ ملنے میں ابھی پورے پندرہ روز باقی ہیں۔ میرے ماں باپ اپنے ورکرز کا اتنا خیال کرتے ہیں اور بیٹی کو والٹیر بول کر ساری محنت کھا جاتے ہیں۔ ظالم لوگ۔۔۔!!“

”ہاں لہنی یہ تو تم واقعی سچ کہہ رہی ہو۔ بڑے ہی ظالم والدین ہیں۔ بیٹی کو ہر جائز خواہش پوری کرتے ہیں۔ تمہاری امی ایک ماہ میں کوئی دس دفعہ تمہارے دوستوں کے لیے ڈنر تیار کرتی ہیں۔۔۔“

ابھی وہ شروع ہی ہوئی تھی۔ بہت لمبی لسٹ گنوائی تھی۔ مگر لہنی نے روک دیا۔

”اچھا بس بس ایک تو تم دوسرے دن مجھے میرے ماں باپ کی مہربانیاں گنوا کر شرمندہ کرنے بیٹھ جاتی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے۔ وہ تمہیں تنخواہ ہی اسی بات کی دیتے ہیں۔ بس ہماری بیٹی کی میٹھی میٹھی عزت افزائی کرتی رہنا۔ اب فون بند کرو۔ میں باتھ روم میں ہوں۔“

”تو بہ استغفار! تو تم نہ بدلنا۔۔۔!!!“

تاسف سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اُس نے کال بند کر دی۔

☆.....☆.....☆

اب جب کہ لہنی جی اپنے منہ سے یہ بات نکال چکی تھیں کہ لاہور کا سفر بذریعہ ٹرین کرنا ہے تو کون مائی کا لال تھا جو اُس کا ذہن بدل سکتا۔ اسی لیے اُس نے اور بلال نے ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ لہنی کو فون کرنے کے بعد ابھی وہ ناشتہ کر کے اپنے آفس بھی نہیں پہنچی تھی۔ جب تک سک سے تیار لہنی نے دھاوا بول دیا۔

”اپنے سارے کام اسی لمحے ادھر ہی چھوڑ دو۔ امی ابو نے تمہیں دو تین ہفتوں کی چھٹی دے دی ہے۔ تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری ذمہ داری دانش دیکھے گا۔ تم فوراً سے اٹھ کر میرے ساتھ شاپنگ پر چلو۔ کل صبح چھ بجے ٹرین نکلتی ہے اور میرے پاس ڈھنگ کا نہ کوئی جوڑا ہے نہ ہی جوتا ہے۔“

”میں نے اپنی ان گناہگار نگاہوں سے ابھی پچھلے ہفتے تمہاری شاپنگ دیکھی تھی۔ جس میں تم نے پورے پانچ نئے پارٹی ڈریس خریدے تھے۔“

”ہاں تو اس بات کو اب پورا ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا ہے۔ اُن میں سے دو جوڑے دوست کی سالگرہ پر پہننے ایک اُسکو گفٹ کر دیا۔ ایک کارنگ مجھ پر سوٹ نہیں کیا۔ ایک امی ابو کی لڑائی کی صلح والے دن پہن لیا تھا۔ اب آ جا کر ایک ہی بچا ہے۔ اب کیا میری یہ اوقات ہے۔ میں اپنی اکلوتی خالہ زاد کی منگنی پر وہی پڑا نے جوڑے پہنوں؟“

”نہیں جتنے مرضی نئے خرید لو۔ ویسے بھی تمہارے ساتھ بحث کر کے اپنا ہی دماغ کا راستہ بنانے والی بات ہے۔ تم نے کونسا اپنا موقف چھوڑنا ہے۔“

”یہ کی ہے نادوستوں والی بات۔۔۔ شاہاش۔۔۔! اب چلو میرے ساتھ تم بھی شاپنگ کرو۔ امی نے خاص تمہارے لیے اگلے مہینے کی تنخواہ ایڈوانس دی ہے۔ کاش اُنکو علم ہوتا کہ تم کس قدر کنجوس مکھی چوس ہو۔ وہی گھسے پٹے گرتے جینز ہی پہنتی رہو گی۔ جواب تک رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے ہو نگے کہ یا اللہ آخر ہم نادانوں نے ایسا کیا گناہ کر دیا تھا جو اس عورت کا نصیب بنے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم بھی اپنے اوپر کچھ پیسے خرچ کر لو۔ جیسے کہ ایک عدد ہیر کٹ کی تمہیں اشد ضرورت ہے۔ پلنگ کے ساتھ ساتھ اتنی رف ہوتی اسکن کا بھی کوئی علاج بنتا ہے۔ سچی بات ہے کہ تم سے زیادہ تو وہ دانش اپنی اسکن کا خیال رکھتا ہے۔ ابھی پرسوں مالی سے اجازت لیکر ایلو ویرا کی دو چار شاخیں توڑ کر گھر لیکر گیا ہے۔ اپنے چہرے اور بالوں میں لگانے کے لیے“

”ہاں تو جوان جہان انسان ہے۔ اُسکا بھی اچھا لگنے کو جی چاہتا ہے۔“ اُس کی بات کو ایک دفعہ پھر لہنی نے اُسی پر اُلٹ دیا۔

”یہ چیز۔۔۔ بالکل یہی چیز میں تمہارے اندر بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”تم میرا وقت ضائع کر رہی ہو اور یاد کروادوں۔ منگنی میری نہیں ملیجہ کی ہے۔ اس لیے آج کا دن جا کر ڈٹ کر کام کرو۔ کل ویسے ہی ہمیں سفر میں ہونا ہے۔“

”ایک بات تو بتاؤ۔۔۔؟“ لہنی کے سنجیدگی سے پوچھنے پر وہ پوری توجہ سے بولی۔

”پوچھو؟“

”کبھی اپنی آدم بیزاری کی وجہ سے شرم بھی آئی ہے یا نہیں؟“

”یہ کیسا فضول سوال ہے۔ تمہیں آخر کہاں سے میں آدم بیزار لگتی ہوں۔ میں کالا چولا ڈال کر جنگلوں میں تو

نہیں بسی ہوئی ہوں۔ تمہارے سامنے اسی دنیا میں رہ کر وہی عام معاملات زندگی نبھاتی ہوں۔ ہاں میں تمہاری طرح فضول خرچ نہیں ہوں۔ بلاوجہ بناؤ سنگھار کرنے کی کوئی وجہ میرے پاس ہے نہیں ہے۔“

”نہیں خیر یہ تو نہ کہو۔ وجہ تو ماشا اللہ بہت بڑی اور پیئڈسم ہے۔ جسے تم خود ہی نظر انداز کئے پھر رہی ہو۔“

لہنی کی بات پر اُس کے چہرے پر سے ساری نرمی جاتی رہی۔

”اب تم جاؤ۔ مجھے کچھ ضروری پیچہ دیکھنے ہیں۔ رات کو شاپنگ پر چلیں گے۔ یا شام کو۔۔۔ مگر ابھی مجھے بہت کام ہے۔“

”ہمیشہ ایسے ہی کرتی ہو۔“

”پھر بھی تم کو نسا سبق لیتی ہو۔ جو ذکر مجھے پسند نہیں۔ کتنی دفعہ کہوں میرے سامنے اُسکا حوالہ بھی استعمال نہ کیا کرو۔ مجھے ایک ایک کر کے ساری باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ اور میرا دل کرتا ہے۔ خود کو ختم کر لوں۔ میں یہاں شوق سے نہیں آئی ہوں۔ فقط اسی ایک رشتے کو بھلانے کے لیے آئی ہوں جو تم وقتاً فوقتاً مجھے یاد کروا کر مجھے بد دل کر دیتی ہو۔“

”اچھا بابا سوری۔۔۔!! چلو تم اپنا کام کرو۔ شام کو کوئی بہانہ مت لیکر بیٹھ جانا۔ اور ہاں تمہاری ساری شاپنگ بھی میری مرضی سے ہوگی۔ میں مزید یہ جینز اور رُرتے برداشت نہیں کر سکتی ہوں۔“

”اچھا۔۔۔ دیکھی جائے گی۔ ابھی تو کھسکو۔۔۔“

لہنی کے وہاں سے ہٹتے ہی وہ اپنے آفس کی جانب بڑھ گئی۔

مگر لہنی شام ہوتے ہی لوٹ آئی اور اس بار اُسکی ایک نہ چلنے دی۔ وہ مجبوراً سارا کام آدھا ادھورا ویسے ہی چھوڑ کر اُس کے ساتھ ہو گئی۔ کیونکہ کل ٹرین مس کرنے کا اُسکا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

اپنے لیے اُس نے اپنی مرضی سے صرف ایک جوڑا لیا۔ ہریرہ کے لیے البتہ ہمیشہ کی طرح دل کھول کر شاپنگ کی اور ملیجہ کے لیے وائٹ گولڈ کالگوں والا انتہائی شائکش سا برسلیٹ لیا۔ جبکہ لہنی حسبِ عادت نہ جانے کیا کیا الم غلم اٹھا کر لے آئی تھی۔ گھر آ کر پیکنگ کرتے وقت اُس نے تین جوڑے اُسکے بیگ میں یہ کہہ کر ٹھونے کہ یہ میری طرف سے تمہارے لیے۔ اُس نے بس مسکرا نے پر اکتفا کیا کیونکہ وہ کبھی بھی وہ سب کپڑے

استعمال کرنے والی نہیں تھی۔ اینڈ پر لٹنی کو خود ہی پہننے تھے۔

اگر سفر میں پورا جلوس نکالنے کو ایک لٹنی کا پھنڈا ڈھول ناکافی تھا تو ساتھ میں اُسکا گرو بلال کی شکل میں موجود تھا۔ سارا راستہ شاید ہی کوئی شاپ ایسا گزرا ہو جس پر ٹرین رُکی ہو اور وہ دونوں نیچے اتر کر کھانے پینے والے اسٹالز پر نہ ٹوٹے ہوں۔ اپنی بوگی میں سے نکل کر دوسرے لوگوں سے ہائے ہیلو کرتے ہوئے بلال نے سب کے سامنے ایک سوا ایک دفعہ کا دیکھا ہوا لٹنی کا ہاتھ دوبارہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے دیکھا دیکھی کئی مرد اور عورتیں ہاتھ دیکھانے کی نیت سے پاس آکھڑے ہوئے۔ اس سارے تماشے کے دوران وہ اُن دونوں سے نظر بھی نہیں ملتا رہی تھی۔ بلکہ چہرے پر صاف بورڈ چسپاں تھا۔

”میں ان دونوں کے ساتھ نہیں ہوں۔ نہ ہی انکو جانتی ہوں۔“

یہ ٹھکر کیا کہ ہریرہ سارا راستہ تقریباً سوتا ہی رہا تھا۔ کچھ بلال کا خلیہ بھی ایسا تھا۔ اسرار شاہ کی طرح لمبے لمبے بال بڑھی ہوئی داڑھی۔۔۔ گھسی پٹی سی جینز کے اوپر سفید کُرتا۔ انگلیوں میں کئی سچے گلوں والی انگوٹھیاں۔۔۔ بھولے لوگ اُسکو کوئی پہنچا ہوا بابا ہی سمجھنے لگتے تھے۔ عمر میں وہ لٹنی سے چھوٹا تھا۔ مگر اپنے قد و قامت کی وجہ سے بڑا لگتا حالانکہ لٹنی بھی کوئی نازک بدن حسینہ نہیں تھی۔ اگر ایک ہاتھ رکھ کر مارتی تو اگلے کو نانی یاد آنا لازمی بات تھی۔

اللہ اللہ کر کے گاڑی لاہور اسٹیشن پر رُکی۔ تینوں کے پاس ٹوٹل چار بیگ تھے۔ کراچی اسٹیشن پر تو کار سے ٹرین تک اُن لوگوں نے اپنا سامان خود اٹھا کر رکھا تھا۔ جبکہ اس وقت ایسی نوبت ہی نہیں آئی۔ بلال سے متاثر ہونے والے لڑکوں نے بخوشی سامان سروں پر اٹھایا اور بلال کے ساتھ جلوس کی شکل میں چل دیئے۔

لٹنی ہریرہ کی طرح آنکھیں پھاڑ کر ارد گرد کا جائزہ لینے میں مصروف تھی جبکہ وہ خود خون کے گھونٹ پی رہی تھی۔

اب نا جانے لٹنی کی خالہ یعنی خدیجہ آنٹی کا ڈرائیور اُنکو لینے کے لیے موجود بھی تھا یا بھول گئے ہونگے۔ ہریرہ آج پہلی دفعہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ اس سے پہلے ملیحہ اپنے امی ابو کے ہمراہ آکر ایک دو دفعہ اُس سے مل چکی تھی۔ جب تک وہ دلیلوں کے زیر اثر لٹنی کی ہمراہی میں ہریرہ کو گود میں اٹھائے اسٹیشن سے باہر آئی۔ بلال گاڑی

پہچان لینے کے بعد سامان رکھوا چکا تھا۔ اُنکو لینے کو کوئی نوکر نہیں آیا تھا۔

سامنے موجود جو آدمی بلال سے بغل گیر ہو رہا تھا، اُس پر نظر پڑتے ہی وہ پھٹی آنکھوں سے اُس کو دیکھتی رہ گئی۔ کان میں خدیجہ آنٹی کے الفاظ اُسکو اپنا مذاق اڑاتے ہوئے محسوس ہوئے جنہوں نے کہا تھا۔ ”جس کی وجہ سے تم نہیں آنا چاہتی ہو۔ وہ جاپان گیا ہوا ہے۔“

مگر اُس کے ساتھ جھوٹ بولا گیا تھا۔

دوسری جانب وہ بھی اُسکو دیکھ چکا تھا۔ وہ اُسکے چہرے پر چونکنے کے تاثرات نوٹ کر گئی تھی اور یہ اُسکی زندگی کا پہلا موقع تھا جب اُس نے میسم طلال کو غور سے دیکھا تھا یا پھر یہ کہنا بہتر ہوگا کہ پہلی باریوں براہ راست دیکھا ہے۔۔ اس وقت اُس نے گہرے براؤن رنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جس کے کف فولڈ کئے ہوئے تھے۔ پیروں میں لیدر کے کالے سینڈل موجود تھے۔

وہ کتنی دیر آنکھیں جھپکائے بغیر اُسکو دیکھتا رہ گیا۔ جو اپنے یہاں آنے کے فیصلے پر سرے سے پچھتا رہی تھی۔ وہ اگلے سو سال بھی اس شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس وقت وہ اُس سے چند قدم کے فاصلے پر آنکھوں میں بے یقینی لیے کھڑا تھا۔

بے یقینی کی جگہ دکھ نے لی اور پھر غصے نے ہر جذبے کو چھپا دیا۔

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ عین اُسکے سامنے آ کر رُکا۔ اس وقت میسم کا سارا فوکس ہریرہ پر تھا۔ جسے محسوس کر کے ہریرہ کی ماں کی گرفت ہریرہ پر اور بھی مضبوط ہو گئی۔

میسم آنکھوں میں نرمی لیے اپنے بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ بیٹا اور اُسکی ماں باقی تو سب کو دیکھ رہے تھے سوائے اُسکے باپ کے۔۔۔

میسم نے ہاتھ بڑھا کر ہریرہ کو گود میں اٹھالیا اور وہ جو ہریرہ کی پیدائش سے بھی بہت پہلے سے یہ سوچ کر بیٹھی تھی۔ کبھی بھی میسم کو اُسکا بیٹا دیکھنے نہیں دے گی۔ اس لمحے کچھ نہ کر پائی۔ بے بسی سے لب کاٹتے ہوئے بس دیکھتی رہ گئی۔

میسم نے ہریرہ کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر اپنے سر سے اونچا کیا۔ جس پر ہریرہ کا دھیان باپ

کی جانب ہوا۔

”ہیلو۔۔۔ بے بی۔۔۔ ڈونو نو آئی ایم؟ ایم پورڈیڈی۔۔۔!!“

نم آنکھوں سے اپنے بیٹے کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے میسم نے اپنا تعارف کروایا۔ دوسری جانب چار ماہ کا ہریرہ آنکھیں بند کر کے اپنے جان لیوا انداز میں مسکرا اٹھا۔

باہنیں نیچے کر کے میسم نے ہریرہ کے ماتھے پر دھیرے سے لب رکھے۔ جو اُسکے ناک میں انگلی ڈال کر آپریشن کرنے کے موڈ میں لگ رہا تھا۔ میسم نے اُسکا ہاتھ نہیں روکا۔ بلکہ مسکراتی نظروں سے اُسکو دیکھتا رہا۔۔۔ لہنی آکر اُسکے گلے ملی تو وہ ہوش کی دنیا میں واپس آیا اور خود اپنی کیفیت پر حیران رہ گیا۔ کیونکہ وہ بالکل فراموش کر گیا تھا کہ وہ اس وقت بیچ راستے کے کھڑا ہے۔

لہنی سے ملنے کے بعد وہ اپنی بیوی کی جانب پلٹ کر دیکھے بغیر بیٹے کو گود میں کسی قیمتی اثاثے کی طرح سیٹھ گاڑی کا جانب بڑھ گیا۔ مگر خود رائیونگ سیٹھ کی جانب جانے کی بجائے پیئجریٹ کی طرف آ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ بلال نے سنبھالی۔۔۔

لہنی اور وہ پچھلی سیٹوں پر براجمان ہوئیں۔ بلال نے گاڑی آگے بڑھا دی تو وہ بلال اور لہنی سے مخاطب ہوا۔۔۔۔

”تم لوگوں کے دل میں بھی اس تمام عرصے میں میرے لیے اتنا سارحہ بھی نہیں آیا کہ تم مجھے بتا سکتے۔ اس سارے وقت میں میرا بیٹا آپ لوگوں کے ہاں موجود تھا۔“

”سوری یار پر خالہ کا حکم تھا۔ ہم کیا کرتے؟“

بلال کی صفائی پر وہ بے دلی سے مسکرا دیا۔ دھیان اب بھی سارا ہریرہ پر ہی تھا۔ جو پہلے تو آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اچانک رونا شروع ہو گیا۔

اُسکی ماں نے ہریرہ کو واپس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے میسم نے نظر انداز کر دیا بلکہ اپنی جیب سے موبائل برآمد کر کے رنگ ٹیون لگا کر ہریرہ کو تھمایا۔ ساتھ ہی اُس کا رونا بند ہو گیا۔

پچھلی سیٹ پر اُس نے آگے بڑھائے ہوئے ہاتھ پہلو میں گرا لیے۔ میسم اُسکو نظر انداز کر رہا تھا۔ جس پر

عام طور پر وہ خوش ہی ہوتی۔ مگر اس وقت نہیں تھی۔ کیونکہ اس وقت ہریرہ میسم کی گود میں تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسکی ساری توجہ اُسی جانب تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ سارا راستہ اسی ایک نقطے کو سوچتی رہ گئی۔ آیا اس آدمی کی آنکھوں میں ڈکھ کس بات کا جاگا تھا۔ بے یقینی سمجھ آتی تھی۔ غصہ بھی جائز تھا۔ پر اُن دونوں کے درمیاں ڈکھ کی جگہ کہاں بچتی تھی۔ مگر اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میسم طلال کی نظروں میں ڈکھ جاگا تھا۔ جو کہ فقط چند سیکنڈ کے لیے ہی تھا۔ مگر تھا ضرور۔۔۔ آج وہ پورے ایک سال بعد وہاں لوٹی تھی۔ بڑا پر تپاک استقبال ہوا تھا۔ خدیجہ نے ساتھ لگا کر پیشانی چومی۔ واری صدقے لگیں۔

ہریرہ کے روئی جیسے گال سب کے باری باری چومنے سے لال ٹماڑ ہو رہے تھے اور وہ راجہ اندر بناسب سے پیار وصول کر رہا تھا۔

میسم اُن سب کے درمیان موجود نہیں تھا۔ کم از کم زباب کو اس بات سے بڑی تقویت مل رہی تھی۔ ملازم نے چائے لگنے کی اطلاع دی۔ طلال احمد کی معیت میں ہی سب ڈائینگ ٹیبل تک آئے۔ خدیجہ ہریرہ کو گود میں لیے ”ابھی آئی“ کہتیں وہاں سے نکل گئیں۔

زباب کی نظروں نے اُنکا پیچھا کیا۔ پھر دل کو یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ وہ اوپر نہیں گئیں تھیں۔ شاید ہریرہ کی پیٹی وغیرہ بدلنے کی نیت سے اپنے کمرے میں لے گئی ہوں۔ خود کو ایسی ہی تاویلیں دیتے ہوئے اُس نے مارے بندھے ایک کپ چائے پی لی۔

البتہ بلال اور لٹنی ہر لحاظ بلائے تاک رکھ کر اپنی خالہ کے گھر کا رزق ایسے کھا رہے تھے جیسے کھانے کا حق ہوتا ہے۔

”زباب بیٹی تم نے تو کچھ لیا ہی نہیں ہے۔ کم از کم یہ سیخ کیک تو ٹرائی کرو۔ یہ تمہاری بہن نے بنایا ہے۔ جو آج کل اپنی ہیکنگ کے شوق میں ہمیں موٹا کر رہی ہے۔“

طلال احمد نے شفقت سے مسکراتے ہوئے زباب کو سیخ کیک کہ آفر کی اور ساتھ ہی اُسکی ہسٹری بتائی۔

جبکہ لہنی اُنکی نفی کرتے ہوئے بولی۔

”خالوجی جانے دیں۔ آپ پر تو چربی کی ایک چھینٹ بھی نہیں ہے۔ موٹا پا آپ کے سامنے موجود ہے۔ اُسکے سامنے خود کو موٹا بول کر اُسکی توہین تو نہ کریں۔“

اُسکا اشارہ بلال کہ جانب تھا۔ جو ایک تو بہت زیادہ قد آوار بندہ تو تھا ہی۔ مگر جسامت بھی جن والی تھی۔ اوپر سے لباس کا انتخاب بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ لوگ نیکرز اور ٹی شرٹس۔۔۔

”بھئی اُسکے ساتھ تو اپنا مقابلہ ہے بھی نہیں۔ یہ رہا جوان بندہ ہم ہوئے ہڈھے لوگ۔ پرہیزی کھانے بھی ڈر ڈر کے کھانے والے۔ اُسکے سامنے تو ہم نے چھوٹا ہی لگتا ہے ناں۔“

”زکوٹے زیادہ خوش مت ہونا۔ ابو یہاں ہتھ ہولا رکھ کر بات کر رہے ہیں۔ آخر آج تمہارا پہلا دن ہے۔ آتے ہی تو عزت افزائی نہیں کر سکتے۔“

ملیمہ کی بات پر بلال ایک کا بڑا سانوا اطلاق سے نیچے بھیجنے کے بعد بولا۔۔۔

”انکل یہ آپ نے بڑا اچھا کیا جو اس سوغات کو ٹھکانے لگا رہے ہیں۔ اب کم از کم میں یہاں آ کر آزادی سے جتنا عرصہ مرضی رہ لیا کرونگا۔ کوئی نوا لے گئے والی نہیں ہوگی۔“

خدیجہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے اندر آئیں۔

”تم دونوں شروع ہو بھی گئے ہو۔ چائے تو سکون سے پی لیتی تھی۔“ پھر زباب سے مخاطب ہوئیں۔

”بیٹی مجھے ہریرہ کا دوسرا لباس دے دو۔ میں بدل دوں۔ اُس نے کپڑوں پر دودھ پھینک دیا ہے۔“

وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ رہنے دیں۔ میں بدل دیتی ہوں۔ ساتھ میں فیڈ بھی کروا دوں گی۔ ایسی کاروائی کے بعد اُسکو بھوک بڑی لگتی ہے۔“

”اچھا جاؤ پھر۔۔۔ اینڈ پرکونے والے کمرے میں بیڈ پر لٹا کر آئی ہوں۔ جا کر اُس کو دیکھ لو۔۔۔“

وہ تیزی سے آگے بڑھ آئی۔ کیونکہ اب ہریرہ اٹھنے کو کوشش میں اپنی جگہ پر لیٹا ہی گھومتا پھرتا تھا۔ اسلیے بیڈ سے گرنے کا خطرہ رہتا۔

ملازمہ کو سامان میں سے ہریہ کے بیک کی نشانی بتا کر بیک لانے کا کہا اور خود اس کمرے کی جانب آ گئی۔

☆.....☆.....☆

امی ہریہ کو اُسکے پاس لیکر آئیں تھیں جسے وہ اندر آتے ہوئے انہی کی گود میں ڈال کر آیا تھا۔

ملیجہ کی کہی بات سچ تھی۔ ہریہ ہو با ہو میسم کو اپنی ہی تصویر لگا۔ بڑی خاص کشش محسوس ہوئی تھی۔ دل کو گرما دینے والی۔ دل کا لوتھڑا جیسے پانی میں بدل گیا ہو۔

اوپر سے ہریہ کی ادائیں۔ وہ اگلے بندے کی ہر بات پر رسپونس کر رہا تھا۔ لہو یں مسکرائے جاتا۔ خدیجہ نے میسم کو چھیڑا۔۔۔

”تمہارا بیٹا تولی لینے والوں کی طرح اپنی بابا مسکراہٹ ہی دیکھائے جاتا ہے۔ ماں باپ تو اتنے ہنس مکھ نہیں ہیں۔ میرا بچہ لگتا ہے۔ اپنی داد پر ہی چلا گیا ہے۔“

میسم نے ہنستے ہوئے ہریہ کو گود میں اٹھا کر ہوا میں اچھلا تھا۔ ہریہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور اندر کا سارا مال منہ کے راہ باپ پر اٹھیل دیا۔ جو اُسکے سر اور سینے پر گرا۔ جواب میں وہ چلا اٹھا۔

”اوئے گندے بچے۔۔۔!!۔۔۔ یہ کیا کیا ہے؟“

خدیجہ کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو رہا تھا۔

”اس کو بیڈ پر ڈالو اور جا کر اپنے کپڑے بدل لوں۔ میں اس کو صاف کرتی ہوں۔“

”پرامی یہ ٹھیک تو ہے۔ اس نے اُلٹی کیوں کی ہے؟ کہیں ٹرین میں کوئی گندی مندی چیز تو نہیں کھالی۔“

وہ اپنی خراب حالت کی پرواہ کئے بغیر فکر مندی کے ساتھ ماں سے استفسار کر رہا تھا۔

”میسم یہ چار ماہ کا بچہ ہے۔ چار سال کا نہیں ہے۔ یہ تو ابھی ماں کے دودھ کے علاوہ کسی غذا سے واقف نہیں

ہے اور اس عمر میں بچے ایسے کام کرتے رہتے ہیں۔ اب آگیا ہے ناں دن رات اس کو سنبھالو سارا پتا لگ جائے گا۔“

”مگر امی اتنا چھوٹا سا بچہ بھلا کیوں بلا وجہ کھانا باہر گرائے گا۔ یقیناً کوئی مسئلہ ہوتا ہوگا۔ آپ اس کو صاف

کریں۔ میں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔“

خدیجہ ایک دفعہ پھر ہنسنے لگیں۔

”میرے دیوانے بیٹے۔۔۔ بچے کا معدہ چھوٹا ہوتا ہے۔ مائع غذا لیتے ہیں۔ ذرا زیادہ مقدار میں اندر جاتی ہے۔ تو اس طرح اچھالنے سے باہر کو نکل آتی ہے۔ جاؤ تم جا کر یہ کپڑے اتارو۔ بدبو آ رہی ہے۔“
وہ حیران ہوتا ہوا الماری میں سے اپنا دوسرا استری شدہ شلوار سوٹ نکال کر واش روم میں گھس گیا۔ کیونکہ سارے بال چپک گئے تھے۔ نہائے بغیر گزارہ نہیں تھا۔ البتہ اس دوران مسکراہٹ نے اُسکے ہونٹوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

لباس پہننے کے بعد تویہ سے سر رگڑتا ہوا۔ واش روم کا لاک کھولنے ہی والا تھا۔ جب باہر سے آنے والی آواز پر ہاتھ رک گیا۔

”آج تو میرے بھالو کو بڑی ہشی آ رہی ہے۔۔۔ ہیں؟؟؟ اپنے ابا کو دیکھ کر خوش ہوئے ہو؟۔۔۔ زیادہ شوخا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں پٹائی کرونگی۔“ وہ بولنے والی کا چہرہ دیکھے بغیر ہی پہچان گیا تھا۔ جواب میں ہریہ کی قلقاریاں گونج رہی تھیں۔

بڑی آہستگی سے بغیر آواز پیدا کئے لاک کھول کر وہ واش روم سے باہر آیا۔
درمیان میں موجود پردے کو سرکا کر کمرے کے اندر آ کر ڈریسنگ کے سامنے سے برش اٹھا کر بال سنوارتے ہوئے گلا صاف کرنے کے شروع ہوا۔

رُباب کی اُسکی جانب پشت تھی جواب اپنے دھیان میں بیٹھی ہریہ کو گود میں لیے فیڈ کر رہی تھی۔ اپنے پیچھے میسم کی آواز سن کر ساکت سی ہو گئی جو کہہ رہا تھا۔

”میرا ایک جی چاہ رہا ہے۔ تمہارے سینے کی گرمی میں محفوظ بیٹھے اپنے بیٹے کو تم سے الگ کروں اور تمہیں اس گھر سے اور اسکی زندگی سے ہمیشہ کے لیے دفع کر دوں۔ یہ چاہت میرے دل کے اُس حصے کی ہے۔ جسے اب تم سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ جو تمہاری شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے۔“

رُباب کو اپنے دل کی دھڑکن کنپٹیوں میں دھڑکتی محسوس ہوئی۔ وہ اُس کے ساتھ آ منسا منسا اس طرح سے تو نہیں چاہتی تھی۔ بند کمرے میں تھا۔

میسیم تو وہ شخص تھا۔ جو جذبات کا اظہار لفظوں کی بجائے عمل سے کرتا تھا چاہے وہ اُس سے ناراض تھا۔ نفرت کرتا تھا۔ مگر وہ تھا تو وہی پرانا والا میسیم طلال۔۔۔۔۔ اُسکا جی چاہا ہریرہ کو کندھے سے لگا کر یہاں سے بھاگ جائے۔ اس شخص سے دور اس گھر سے دور۔۔۔۔۔ میں آخر کیوں آگئی؟؟؟

میسیم اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے برش واپس رکھ کر چلتا ہوا زباب کی جانب آیا۔ گُرسی اٹھا کر بیڈ کے پاس عین زباب کی سامنے رکھ کر ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گیا۔

نظریں زباب کے چہرے پر گڑی جا رہی تھیں۔ جو پیرٹ اور گرین کنٹراسٹ کا سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ جس پر آتش کے ایک شیڈ سے پامپنگ ہوئی تھی۔ سامنے گلے پر آتش ہی بڑا سا پھول بنا ہوا تھا۔ دوپٹہ تین رنگوں کا تھا۔ لٹریز میں کسے سلکی بال چہرے کے دونوں جانب ہالے کی صورت میں گرے ہوئے تھے۔ وہ دل میں اتر جانے کی حد تک خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ تو پہلے ہی اگلے کے دل میں گھر بنا چکی ہوئی تھی۔ اس صورت میں سامنے والے کی حالت کا خود ہی اندازہ لگالیں۔ جبکہ وہ نگاہیں اٹھکائے بیٹھی پچھتا رہی تھی۔ وہ بولا۔

”اور میرے دل کا ایک حصہ کہہ رہا ہے۔ میں تمہارے سامنے بیٹھ کر ایک دفعہ غور سے تمہارا ہر ہر نقش پڑھوں۔۔۔ آیا ماں بن کر تمہارے حسن میں اور کتنا اضافہ ہوا ہے۔ جانتی ہو یہ میرے دل کے کس حصے کی خواہش ہے؟ یہ میرے دل کا وہ والا حصہ ہے جس نے تمہیں پانے کے پہلے لمحے سے ہی تم سے محبت کی تھی۔ جس محبت کے منہ پر تم نے وہ طمانچہ مارا ہے جسے دیکھ کر میں یہی کہوں گا۔ کوئی خودکشی تو کر لے۔ پر محبت نہ کرے۔“ وہ جانتی تھی کہ ہریرہ کا پیٹ ابھی نہیں بھرا ہوگا۔ مگر وہ سو گیا تھا۔ اُس نے اُسکو ہلا کر متوجہ کرنے کی بجائے دوپٹے کے نیچے سے ہی کھینچ کر اپنا دامن سیدھا کیا۔ کانپتے ہاتھوں سے ہریرہ کو بیڈ کے درمیان میں لٹایا۔ پانکٹی پر رکھا کبیل اس پر ڈالا اور جلدی سے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے ایک جھٹکے سے رُک گئی۔

اُسکی کلائی میسیم کی گرفت میں تھی اور وہ پھنکارتے ہوئے بولا۔

”کب تک مجھ سے بھاگنا ہے؟ آخر ایک نہ ایک دن تمہیں میرے روبرو ہو کر میرے سوالوں کے جواب دینے ہی پڑیں گے۔ قدرت نے اگر آج کا موقع فراہم کر ہی دیا ہے۔ تو مجھے تم سے میرے ہر سوال کا جواب چاہیے۔“

گرفت اتنی مضبوط تھی۔ رباب کو اپنی جلد میں اُسکی انگلیاں کھستی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اُس کی جانب دیکھنے سے مکمل طور پر اجتناب کرتے ہوئے رباب نے اپنے دوسرے ہاتھ کی مدد سے اپنا بازو چھڑوانا چاہا۔ مگر میسم نے اُسکا وہ ہاتھ دوسرے ہاتھ میں لیکر دونوں بازوؤں اُسکی پشت کی جانب موڑ کر قہام لیے۔

اب رباب کا چہرہ میسم کے سینے سے مس ہو رہا تھا اور میسم کے بازوؤں کے گھیرے میں سر جھکائے کھڑی آنسو پینے کی کوششوں میں تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

”میں نے کہیں پر ایک پنجابی کا شعر پڑھا تھا۔ سُنو گی؟“

”پلیز مجھے چھوڑ دیں۔۔۔۔۔“

”شاعر کہتا ہے۔

لکھ بھادیں ہار سنگھار کرے 'پئی نخرے ناز ہزار کرے

جس نوں پر یتیم اپنا نہ سمجھے، ادا بے نہا گن ہوئی نہیں۔۔۔۔۔“

تم نے ایک دن بھی میرے لیے ہار سنگھار نہیں کیا۔ تم نے کبھی بھی مجھے ناز ادا نہیں دیکھا کر میرا دل ٹھہانے کی کوشش نہیں کی اور میں نے پھر بھی تم سے محبت کی۔ تمہیں اپنی ذات کا حصہ بنایا۔ تم نے کیا سمجھا تھا۔ ایک ڈے ڈر میر، ناکام سالز کا جو شو ہر بننے کی خوشی میں اندھا ہوا، اپنے ازدواجی حقوق وصول کر رہا ہے۔ معاملے کی سنگینی سے واقف ہی نہیں ہے۔“

”میسم پلیز مجھے جانے دیں۔۔۔۔۔“

ایک عدد آنسو پلکوں کی باز توڑ کر بہہ گیا تھا۔ وہ پھر بھی ہمت کرتے ہوئے احتجاج کر رہی تھی۔

”گاڈ ڈیمڈ میں تمہاری ہر تکلیف سے واقف تھا۔ کیونکہ مجھ پر بھی وہی کچھ بیٹا تھا۔ جو کچھ تم نے سہا۔۔۔۔۔“

اس دفعہ وہ چیخ اٹھی۔۔۔۔۔

”آپ واقف نہیں تھے۔۔۔!! آپ کو میری تکلیف کا اندازہ تک نہیں تھا۔ نہ ہی آپ پر وہ سب بیٹا جو میں

نے سہا ہے۔ نہ آپ کے ماں باپ چھوٹے ہیں۔ نہ آپ کے کردار پر کچھ اچھا لا گیا۔ نہ آپ کی جگہ ہنسائی

ہوئی۔ نہ کسی رشتے کو کھونا پڑا۔ نہیں ناں؟ میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہے اور جس کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ چاہتا

ہے۔ میں ہر بات بھول کر اُسکے ساتھ ایک شاندار قسم کی ازدواجی زندگی گزاروں۔ آپ محبت کی بات کرتے ہیں۔ اپنے دوستوں کی دعوتیں یوں وصول کرتے رہے۔ جیسے یہ شادی دلی خواہش کی بنا پر ہوئی ہو۔ آپ کو مجھ سے نفرت کرنی چاہیے تھی۔ سب کے سامنے مجھے بُرا بھلا کہنا چاہیے تھا۔ سب کو سچ سے واقف کرنا چاہیے تھا۔ تاکہ لوگوں کو علم ہوتا یہ نکاح آپ کی کنپٹی پر بندوق تان کر کروایا گیا تھا۔ زبردستی مجھے آپ کی بیوی بنایا گیا تھا۔ تو ہو سکتا ہے۔ میرے جلتے دل پر کچھ ٹھنڈی چھینٹیں پڑتیں۔ میرے کردار پر لگے داغ کا کچھ حصہ تو کم ہوتا۔“

وہ خود اذیتی کو دھیرے سے مُسکرایا۔ اُسکے بازوؤں پر گرفت ڈھیلی کر دی مگر کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے اور رُباب کے درمیان کا فاصلہ بالکل ختم کر دیا۔ رُباب جان گئی تھی وہ جتنا احتجاج کرے گی، وہ اتنا ہی ضد میں آئے گا۔ اس لیے دھیمی پڑ گئی۔

”کیا تم نے اس نقطے پر غور کیا ہے۔ آج تم وہ پہلے والی سرد مہر خاموش رُباب بالکل نہیں ہو۔ آج تم میرے ہر عمل پر ردِ عمل دیکھا رہی ہو۔ جس لڑکی کو آج میں نے ٹرین سٹیشن پر گود میں بچہ اٹھائے دیکھا ہے۔ وہ کوئی اپنی زندگی سے اُکتائی دکھی سی بے بس لڑکی تو نہیں ہے۔ وہ تو بڑی بڑا اعتماد، خوش اور مطمئن لڑکی ہے۔ کبھی دوپہل کو سوچا کہ ایسا کیوں ہے۔؟ سوچا ہے؟“

”میری خوشی کی وجہ میرا ہریرہ ہے۔ اُس نے مجھے مکمل کر دیا ہے۔ دل پر ابھرے سارے گڑھے، کھڈے پُر کر دیئے ہیں۔ میں ماضی کو سوچ کر غمزہ ہوتی بھی ہوں۔ تو جب نظر اس کے چہرے پر پڑتی ہے۔ یہ مجھے دیکھ کر مُسکرا رہا ہوتا ہے۔ جواب میں مجھے ہر غم بھول جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے۔ اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی اگر میں ماضی میں گم رہوں گی۔ تو یہ بہت بڑی ناشکری ہوگی۔“

اس دفعہ وہ جواب میں کتنی دیر بول تک نہ سکا۔ رُباب کی کمر سے اپنا بازو ہٹا لیا۔ وہ شاید اسی انتظار میں تھی۔ فوراً اُسکے اور اپنے درمیان فاصلہ پیدا کرتے ہوئے دور ہو کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنی پہلے والی نشست پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

”جس دن تم اور میں جی ٹی روڈ پر چلتے ہوئے آرہے تھے۔ کیا تمہیں وہ دن یاد ہے؟ میرا منہ سڑ جا ہوا تھا۔ ایک آنکھ بالکل نہیں کھل رہی تھی۔ میری پسلیوں میں اتنا درد تھا۔ کہ ایک ایک قدم اٹھانا بھی تکلیف کا باعث بن

رہا تھا۔ میرا دماغ غصے سے ابل رہا تھا۔ کونسا وقت ہوتا جب میں لاہور پہنچ کر پولیس سے رابطہ کرتا۔ میں نے پورا ادارہ کر لیا ہوا تھا۔ مجھے اُن لوگوں کی ایک دفعہ ٹھکانی ضرور کروانی ہے۔

اُس وقت تک ذہنی طور پر میں اکیلا ہی سڑک کے کنارے اپنی پیٹرول ختم ہوئی ٹوٹے چین والی موٹر سائیکل کو گھسیٹے جا رہا تھا۔

جب اپنے پیچھے سے آتی آواز پر چونکا۔۔۔۔۔

آدھے گھنٹے کی سنگت میں تم نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ اور مجھے بتایا کہ آگے نظر آنے والے اسٹاپ پر ایک چھوٹی سی ورکشاپ ہے۔ جہاں سے پیٹرول بھی مل جاتا ہے۔ ساتھ ہی تم نے دو تین ہزار کے نوٹ میری جانب بڑھائے۔ میرا حقیقی طور پر خون کھول گیا تھا۔ جی چاہا تمہیں اٹھا کر کسی ہائی سپیڈ سے جاتے ٹرک کے نیچے پھینک دوں مگر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

دو چار ڈکانوں میں سے ایک واقعی ورکشاپ تھی۔ انہوں نے موٹر سائیکل کا جائزہ لیا۔ اور ٹھیک کرنے کی حامی بھری۔ البتہ وہ آدمی میری حالت دیکھ کر مشکوک ہو رہا تھا۔ میں نے ایکسیڈنٹ کی فرضی کہانی سنا کر فون کرنے کی سہولت کا پوچھا۔ جس پر اُس نے اپنا موبائل نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔

فیصل کو فون کر کے اُدھر آنے کا کہہ کر جب میں تھوڑا سکون سے بیٹھا تب میری نظر تم پر پڑی۔ شاپ سے ہٹ کر درختوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کر رہی تھیں۔ وہ پہلا لمحہ تھا۔ جب میں نے تمہیں زباب عالم کی بجائے زباب میسم کے طور پر دیکھا تھا۔ میں زباب عالم سے واقف تھا۔ مگر ایک یونیورسٹی فیلو کے طور پر۔ آتے جاتے کبھی کہیں نظر آ گئیں۔ اپنے حال میں مگن اپنے کام سے کام رکھنے والی ایک ایسی لڑکی جس کا آج تک کسی کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی افیر نہیں سنا تھا۔ جس کو کبھی کسی غیر مناسب سرگرمی میں ملوث نہیں دیکھا تھا۔ جس کی دوستوں کا گروپ بھی انتہائی سلیبی اور لائق فائق لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ یہ سب اپنے ذہن میں تازہ کرنے کے بعد میں نے اُدھر لکڑی کے بیچ پر بیٹھے ہوئے ہی خود سے پوچھا تھا۔

”اس نے ایسا کیا کر دیا ہے؟ جو اسکے گھر والوں نے اس جیسی لڑکی کے ساتھ بھی ایسا سلوک کیا؟۔۔۔ اور

دوسرا سوال میں نے خود سے یہ کیا کہ کیا اب میں بھی اسکو اپنے غصے اور نفرت کا شکار بناؤں گا؟“ کیونکہ جیسے بھی ہے اس لڑکی کا اختیار اب میرے ہاتھ میں دیا گیا ہے اور میں تمہارے گھر والوں کے رویے کا بدلاتم سے با آسانی لے سکتا تھا۔ تمہیں وہیں چھوڑ کر گھر آ جاتا۔ کسی ہوٹل میں لیجا کر دو چار دن ساتھ گزارتا اور اُسکے بعد اپنی راہ لے لیتا۔ مجھے ایسا کرنے سے کون روکتا؟ میرے ماں باپ یہ سمجھتے۔ میں دوستوں کے ساتھ کہیں گھومنے نکل گیا ہوا ہوں۔ اس نکاح سے صرف تمہاری فیملی واقف تھی۔ میرا تو جگری یار تک بے خبر تھا۔ تمہیں انہی لمحوں میں طلاق دے دیتا۔ جو مرضی کرتا بھی مگر نہیں۔۔۔ میں نے برائی کا بدلا برائی سے نہیں دیا۔ میرے ہاتھ میں اختیار آتے ہی میں اندھا نہیں ہوا۔ تمہارے گھر والوں کا بدلاتم سے نہیں لیا۔ بلکہ تمہیں اپنی عزت مان لیا اور اپنے آپ کو وہی بات کہی جو تم ہریرہ کے حوالے سے خود کو کہتی ہو۔ یہ ٹیک عورت کسی حادثے کے تحت ہی سہی پر مجھے اگر مل ہی گئی ہے تو میں غیر اہم باتوں کو سوچ کر ناشکری کیوں کروں؟ اللہ نے تمہیں میرا لباس بنایا ہے۔ مجھے تمہارا۔ میں نے دنیا کے سامنے تمہیں بے آبرو نہیں ہونے دیا۔ تمہیں ڈھانپ لیا۔ مگر تم نے سب کے سامنے مجھے نکلا کر دیا۔“

”کاش آپ مجھے وہیں چھوڑ آتے۔ کاش آپ کو اندازہ ہو پاتا کہ جن ہاتھوں سے کسی کو زخم دیا جائے۔ انہی ہاتھوں سے مسیحائی نہیں کی جاسکتی۔ میں وہاں پر موجود ہی آپکی وجہ سے تھی۔ آپ میرے قصور وار ہیں۔ میرے محسن نہیں ہیں۔“

”محسن کا لفظ اپنے لیے میں استعمال کرنا ہی نہیں چاہتا۔ شوہر ٹھیک ہے۔ مگر یہ قصور وار والی بات میری سمجھ نہیں آئی۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟“

”سیر۔ سلی آپ میرے ساتھ یہ انجان بننے کی گیم کھیلنا چاہتے ہیں؟“

”میں کوئی گیم نہیں کھیل رہا ہوں۔ تم سے سادہ الفاظ میں اپنا قصور بتانے کا کہا ہے۔“

”آپ میرے پیچھے کیوں آئے تھے۔ میں آپکی کیا لگتی تھی؟ کس ناتے سے میرے گھر والوں سے آ کر میری خیریت جاننے کا شوق چڑھا تھا؟ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ تھی۔ وہ لوگ میرے سے ناراض تھے۔ مگر سب وقتی تھا۔ میری چچی کی جانب سے اتنا بڑا ایثار بنایا گیا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کے ساتھ میری مکمل ختم کر دی۔ مگر ایک دفعہ ابو کا غصہ اتر جاتا سب ٹھیک ہو جاتا تھا مگر نہیں آپ نے آ کر میری زندگی اجیرن بنائی تھی۔“

مجھ سے میرے اپنے چھینے تھے۔“

”اوہ ایک منٹ۔۔۔!! ایک منٹ ذرا اپنی یہ تقریر بند کرو۔ میں نے تم سے تمہارے اپنے چھینے ہیں؟ کیا تمہاری مت ہی ماری گئی ہے۔“

”میرے پاس ثبوت موجود ہے۔ آپ نے خود میرے کزن کو بولا تھا۔ زباب کا بوائے فرینڈ ہوں۔ بڑے دنوں سے اُس نے میرے ساتھ رابطہ نہیں کیا ہے۔ ہم لوگوں نے جینے مرنے کی ساتھ قسمیں کھائی ہوئی ہیں۔ اسلیے اُسکی خبر لینے آیا ہوں۔“

وہ جو اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے میں ادھر سے ادھر چکر کاٹتے ہوئے اپنے غصے پر قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ الفاظ سن کر ختم گیا۔

زباب کو اُسکی آنکھوں سے شعلے نکلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اُسکے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ ماتھے کی رگ تھرک رہی تھی۔ سفید بے شکن لباس میں اُسکی سفیدی مائل سانولی رنگت میں اس وقت گلابیاں گھلی ہوئی تھیں۔ زباب کے دل نے گواہی دی۔ بلاشبہ یہ مرد دنیا کے خوبصورت مردوں میں سے ایک ہے۔ پر وہ اُسکو یہ بات کہہ نہیں سکتی تھی۔ وہ اُسکی آنکھوں میں نظریں پیوست کیے بولا۔

”ہاں یہ الفاظ میرے ہی ہیں۔ میں نے یہ سب کہا تھا۔ مگر اس وقت اہم بات یہ نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تمہارے لیے قابل بھروسہ شخص میں نہیں ہوں۔ جس نے تب بھی تمہارا ساتھ دیا تھا۔ جب میں تمہارا نامحرم تھا۔ بلکہ تمہارے لیے قابل اعتبار وہ گھٹیا اور بے غیرت شخص ہے۔ جس نے سارا ڈرامہ کیا۔ یہ بات تم نے مجھے تب کیوں نہ بتائی جب میرے ساتھ آرہی تھیں۔ تاکہ میں تمہیں واپس تمہارے کزن کے پاس چھوڑ کر آتا۔ تاکہ اس سارے کھیل میں سارے نقصان میرے حصے میں نہ آتے۔ کم از کم میں اس تعلق کو اُس مقام تک نہ لے جاتا جہاں سے یہ بچہ دنیا میں آیا۔“

”آپ ہریرہ کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کریں۔ نہ ہی اسکو درمیان میں لائیں گے۔ یہ صرف میرا بیٹا ہے۔“

”کیا واقعی؟ کیا واقعی یہ صرف تمہارا بیٹا ہے؟ یہ تمہارا نہیں ہے۔ یہ صرف اور صرف میرا خون ہے۔ میں مخلص

تھا۔ میرے جذبے پاک تھے۔ صرف میں نے تمہیں سچے دل سے اپنایا تھا۔ تم تو اپنے دل میں اتنی ساری بدگمانی اور نفرت چھپائے ہوئے تھیں۔ امی سے یہی کہا تھا تا تم نے کہ تمہیں اگر میرے ساتھ رہنے پر مجبور کیا گیا تو تم اپنے ساتھ ساتھ اس بچے کو بھی ختم کر دو گی۔“

بیڈ کی پابندی پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے، وہ زار و قطار رو رہی تھی۔
 ”آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔“

”ہاں تم مجھے جیتے جی مارد و اور میں تمہیں تمہاری غلطیاں بھی نہ گنواؤں؟“

”آپ جو مرضی کہہ لیں۔ میرا فیصلہ آج بھی وہی ہے۔ میں لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع نہیں دے سکتی۔ میں کبھی برداشت نہی کر سکتی لوگ کہیں ایک مرد کے لیے ماں باپ کو چھوڑ دیا ہے۔“

”پہلی بات تو یہ ایسا صرف وہ بولے گا۔ جو عقل کا اندھا ہوگا۔ ورنہ تمہارے والدین بھی جانتے ہیں۔ یہ شادی صرف انکی مرضی سے ہوئی ہے اور دوسرا ذرا ایک پل کو اس نگاہ سے بھی سوچ لینا کہ لوگ یہ نہیں کہیں گے۔ پہلے اس آدمی کے لیے ماں باپ کو چھوڑا۔ اب نہ جانے اور کون ہے جس کے لیے اسکو بھی چھوڑ گئی۔ اپنے بچے تک کا خیال نہیں کیا۔“ آنسو اسکی نگاہوں میں ٹھہر کر رُک گئے۔ اُس نے نظر اٹھا کر غصے سے میسم کو گھورا۔۔۔

”آپکی جرات بھی کیسے ہوئی میرے بارے میں ایسا کہنے کی۔“

”میری جرات کی بات مت کرو۔ بلکہ میری ہمت کو داد دو۔ پورا ایک سال۔۔۔ ایک سال تم میرے گھر سے غائب رہی ہو۔ مجھے بتائے بغیر۔۔۔ میری مرضی کے بغیر گئی تھیں۔ میں تمہارے دروازے پر بندھا کوئی کتا نہیں تھا۔ میں تمہارا شوہر ہوں۔ کوئی غیر کہیں جائے تو ایک جگہ رہنے کی صورت میں اپنے ساتھی کو بتا کر جانا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے۔ میں تو پھر تمہارا شوہر تھا۔ سب سے زیادہ تم پر حق ہی میرا ہے۔ تم پر تمہارے خود سے زیادہ میرا حق ہے۔“

وہ اس شخص کے اظہار کی گہرائیوں سے واقف تھی۔ پہلے نرمی و محبت کا اظہار دیکھا تھا۔ آج اسکی شخصیت کا یہ روپ دیکھ رہی تھی۔ اپنی ہمت جمع کر کے بولی۔۔۔

”آپ جو مرضی کہہ لیں۔ میرے لیے تب بھی آپ سے دور ہونا ضروری تھا۔ آج بھی ضروری ہے۔ آپ کو

ایک دودن میں خلع کا دوسرا نوٹس مل جائے گا۔ امید کرتی ہوں۔ آپ مجھے طلاق دے دیں گے۔“

”تمہیں کیوں کر خوش فہمی ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہوں گا۔ وومن وی آر ڈن۔ تم نے کیس عدالت میں لیجا کر میری آدمی مشکل آسان کر دی ہوئی ہے۔ مجھے تو بس اپنے وکیل سے رابطہ کرنا ہے۔ پھر وہ تمہارے وکیل کے سامنے میری شرائط کھول کر بیان کر دے گا۔ جو اگر تمہیں منظور ہوئیں تو معاملات جلد نمٹ جائیں گے۔ ویسے بھی میں بہت وقت برباد کر چکا ہوں۔ اب میں اپنی زندگی کسی مخلص عورت کے ساتھ دوبارہ سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ تم ہم لوگوں سے بہت دور چلی جاؤ۔“

رُباب کے گال سُرخ ہو گئے۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”کیسی شرائط؟“

”مجھے میرے بیٹے کی کسٹڈی عدالت دے ہی دے گی۔ جب میں اُنکے سامنے ساری حقیقت کھول کر بیان کروں گا۔ مگر مجھے تمہاری طرف سے بھی لکھا ہوا بیان چاہیے کہ تم کبھی میرے بیٹے سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں کرو گی۔“

رُباب کے چہرے سے سارا خون نچڑ گیا۔ اڑے رنگ کے ساتھ وہ بے یقینی کے تحت اپنی جگہ سے اٹھی۔

”میں مر تو سکتی ہوں۔ مگر ہریرہ نہیں دے سکتی۔۔۔“

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی جو کہ بڑی زور کی تھی۔

میسم کی جھنجھلائی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

”کون ہے بھئی۔۔۔؟“

”بھائی صاحب کیا بیوی کے آتے ہی بہن بھائی بھول گئے؟“

بلال کی آواز پر میسم نے جھڑک دیا۔ ”فضول بکو اس چھوڑ کر مطلب کی بات کرو۔“

”باہر ملیحہ کے سُسرال والے آئے ہیں۔ خالہ آپ دونوں کو بلا رہی ہیں۔“

”آتا ہوں۔۔۔“ میسم کے کہنے پر دروازے کے دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

وہ رُباب کو اگنور کر کے ڈیرینگ ٹیبل کی جانب بڑھا۔ بال ایک دفعہ پھر برش کئے۔ خود پر پر فیوم چھڑکا۔

آئینے میں نظر آتے اسکے عکس کو مخاطب کیا۔ جو بت بنی کھڑی زمین کو گھور رہی تھی۔

”اب اگر تم میری بات سے اتفاق کرتی ہو۔ تو ہم اپنے معاملات عدالت کے باہر ہی طے کر لیں گے۔ تم آج ایگریمنٹ پر سائن کر دو۔ میں اُسی وقت تمہیں طلاق دے دوں گا۔ جب تک ایسا نہ ہو۔ تب تک مجھ سے بھلائی کی اُمید بھی مت رکھنا۔ کیونکہ اب میں پہلے والا میسم نہیں رہا ہوں۔ تم نے مجھے بدل دیا ہے۔ اس دفعہ بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ بلکہ سوچنا بھی مت۔ آج جس وقت تم نے گھر میں قدم رکھا تھا۔ اُسی وقت میں نے گیٹ پر ایک آدمی صرف تمہاری نگرانی کے لیے بیٹھا دیا ہے۔ میرے بیٹے کو لیکر تمہیں کہیں بھی اکیلے جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔“

”کیا آپ مجھے یہاں قید کر کے رکھیں گے؟“

وہ آکر عین اُسکے سامنے رُکا۔ خوشبو کے جھونکے نے رُباب کو کچھ پرانی یادیں عطا کیں۔ وہ بڑے دلنشیں انداز میں مسکراتی نظروں سے اُسکی وہشت زدہ نظروں میں دیکھتے ہوئے۔ اُسکے چہرے پر ایک ہل کوٹھکا۔ عمل دو سیکنڈ کا تھا۔ پر رُباب کے حواس کسی قدر جھنجھٹا اٹھے تھے۔ وہ کچھ کہہ بھی نہ پائی۔

”جانے من میں ہر وہ اقدام کروں گا۔ جو مجھے ضروری لگے گا۔ پلیز مجھے اس طرح سے مت دیکھو۔ کہیں مجھے تم پر رحم ہی نہ آجائے۔“

وہ مسکرا رہا تھا۔ بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔ رُباب کے لب ہل بھی نہ سکے۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر ایک ہل کوڑک کر اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اور ہاں بہت بہت شکریہ اتنا پیارا بیٹا دینے کے لیے۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ بھی اپنے باپ کی طرح ہی جی بھر کر ہینڈسم ہے۔“

رُباب کی شکل دیکھ کر اُسکو ہنسی تو آئی مگر بڑی خوبصورتی سے مٹھا گیا۔

”ویلم بیک۔۔۔۔۔“ کہہ کر اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا وہاں سے چلا گیا۔

رُباب کتنی دیر خالی دماغ کے ساتھ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ ایک ایک زخم تازہ ہو گیا تھا۔ تکلیف اس قدر تھی۔ سانس لینا بھی دشوار لگ رہا تھا۔ کتنی دیر گزر جانے کے بعد اُس نے نظر موڑ کر اپنی جان کو دیکھا۔ دونوں

بازوں اور پر کو موڑے مٹھیاں بھیجنے نہ سکون سویا ہوا تھا۔ آگے بڑھ کر اُسکو آغوش میں بھر کر کتنی دیر اُسکا منہ چومتی اور روتی رہی۔

”تم میرے ہر درد کی دوا ہو ہریرہ مجھ سے الگ مت ہونا۔“

”مجھے سب نے چھوڑ دیا۔ تم مت چھوڑنا۔“

ماں کی یاد آئی تو ہچکی بندھ گئی۔ باپ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آیا تو شکوہ سسکی بن کر زبان سے نکلا۔۔۔
”آپ نے اپنی رباب کو جانا ہی نہیں۔ آپ نے بھی مجھے لوگوں کی نظر سے ہی دیکھا۔ کیوں؟ اب آکر دیکھیں میرا بچہ مجھ سے چھینا جا رہا ہے۔ میں اسکو کسی کے حوالے نہیں کروں گی۔ میں خود کو ہی ختم کر دوں گی۔“
روتے ہوئے نہ جانے کتنی دیر تک خود کلامی کرتی رہتی۔ ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔ ☆

وہ فائن آرٹس کی سٹوڈنٹ تھی۔ اُسکورنگوں سے ہمیشہ سے عشق تھا۔ مگر پینٹنگ کی بجائے اُسکا رجحان فوٹو گرافی کی جانب تھا۔ کچھ اُسکا تعلق میدانی علاقے سے تھا۔ جہاں ہر طرف ہریالی کا راج رہتا۔ مون سون کا سیزن اُسکو بہت عزیز تھا۔ جب بارشیں سیلاب کا باعث تو بنتی ہی تھیں۔ مگر جو قدرتی نظارے دیکھنے کو ملتے وہ اپنا جواب آپ تھے۔ گھر میں اُس سے چھوٹا صرف ایک بھائی ہی تھا۔ جو عمر میں ایک سال ہی اُس سے چھوٹا تھا۔ اسلیے باجیوں والا زعب ڈالنے کا موقع کبھی نہ مل سکا۔ امی سے وہ لاڈ اٹھواتی نہ تھکتی۔ پر ابو کی طبیعت ایسی زعب دار تھی۔ کبھی نہ خود ہی انہوں نے اولاد کے ساتھ فری ہو کر بات چیت کی نہ اولاد کو ایسی اجازت دی۔ وہ جب گھر سے باہر ہوتے تو دونوں بہن بھائی نے شرارتیں کر کر کے امی کی ناک میں دم کیا ہوتا تھا۔ مگر جو نبی ابو گھر میں قدم رکھتے ہر طرف خاموشی چھا جاتی۔ دونوں ہی اتنے تہذیب یافتہ نظر آتے کہ اُن کو دیکھ کر کوئی یہ یقین نہ کر پاتا یہ وہی بچے ہیں۔ جو ابھی کچھ دیر قبل ایک دوسرے کو ملے اور گھونسنے نواز رہے تھے۔ جوں جوں عبداللہ بڑا ہوا۔ حویلی وغیرہ میں ابو کے ساتھ آنے جانے لگا۔ وہ تو ابو سے تھوڑی بہت دوستی بنا ہی گیا۔ مگر یہ خوش قسمتی رباب کے نصیب میں نہ ہوئی۔ کالج کے بعد یونیورسٹی تک میں داخلے کے لیے وہ ابوتک سارے پیغام امی کے ذریعے ہی پہنچاتی۔ یہاں بھی عبداللہ ابو کا اس لحاظ سے فیورٹ ہو گیا کہ اُسکو سائنس میں دلچسپی تھی۔ اور سائنس ابو کا فیورٹ مضمون تھا۔ بلکہ اُنکی رائے کے مطابق جس نے سائنس نہیں پڑی اُس نے اپنی زندگی تو گزار لی ہے۔ مگر پڑھا

کچھ نہیں۔ زباب کو سائنس سے خاص چڑ رہی۔ فائن آرٹس کا نام سنتے ہی ابو نے انتہائی نرا منہ بنایا۔ مگر امی کی ہمت جنہوں نے کسی بھی طرح سہی مگر زباب کو اجازت دلوا ہی دی۔ وہ بڑی خوش تھی۔ مگر پھر ایک دن چچا اپنے بیٹے کا رشتہ لیکر آ گئے۔ بیٹا بھی وہ جو زباب کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق۔ پر یہاں پر ابو کی فائن آرٹس والی چھین نکالنے کے لیے اُس نے ماں کے پوچھنے پر چپ چاپ ہاں میں سر ہلا دیا۔ ایسے ایک دفعہ پھر اُس کا نام ابو کی گڈ لسٹ میں آنے کے لیے انتظار والی لسٹ تک پہنچ گیا۔

پیسروں کے بعد کی ٹھٹھیاں تھیں۔ جب اُسکی کزن جمع ہمسائی جمع ہونے والی نند کا فون آیا۔ لاہور میں یونیورسٹی کی انتظامیہ نے طالبات کو اپنے ہنر کو لوگوں میں پیش کرنے کا موقع دیتے ہوئے۔ ایک آرٹ گیلری بک کروائی تھی۔ جس میں کہ ساری یونیورسٹی کے طلبہ طالبات کو اپنا اپنا کام دیکھانے کی اجازت تھی۔ زباب کو لگا کہ اور کیا چاہیے۔ آج تک تصویریں بنانا کراُس نے اپنا سارا سٹور بھرا ہوا تھا۔ پر کہیں ایسا پلیٹ فارم میسر نہ آیا تھا۔ جہاں وہ یہ کام دنیا کے سامنے لا پاتی۔ اُس نے امی سے بات کی۔ انہوں نے ”ابو کو اچھا نہیں لگے گا“ کہہ کر وہیں بات ختم کر دی۔ مگر اُس نے بھی اُنکا پلان نہیں چھوڑا۔ آخر منوا کر ہی سانس لیا۔ ابو کی جانب سے اجازت پھر بھی نہ ملی۔ مگر اُسکو یہ تسلی رہی خود ہی امی ابو کو منوالیں گی۔ اُسکے شوق کو دیکھتے ہوئے۔ امی سے بھی اُسکو روکا نہ گیا۔ آخر اس میں بظاہر بُرائی بھی کیا تھی۔ ابو چاچو کے ساتھ ادا کاڑھ گئے ہوئے تھے۔ جہاں سے وہ ہر سال اعلیٰ نسل کی دودھ دینے والی بھینسیں خریدنے جاتے تھے۔ ادھر سے لائی گئی اچھی بھینس ادھر لا کر بیچنے سے کافی بچت ہوتی تھی۔

اُسکو لگا یہ بھی اللہ کی جانب سے غیبی مدد ہوئی ہے۔ ابو کے جاتے ہی اُس نے اپنا سارا سامان گاڑی میں لدوایا اور شارق کے ساتھ نارووال سے لاہور آ گئی۔

شارق سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اچھی ہیلو ہائے ہو گئی تھی۔ وہ اکثر اُسکو لانے لیجانے کی ڈیوٹی بخوشی انجام دیتا تھا۔ اسلیے اگر اُسکے دل میں شارق کی محبت پیدا نہیں ہوئی تھی تو نفرت بھی نہیں تھی۔

ساری تیاری اُس نے شارق عبداللہ اور نانکھ کے ساتھ مل کر ہی کی تھی۔ مگر نمائش والے دن ابو اور چچا کے مشترکہ دوست کی بیٹی کی شادی تھی۔ جس پر وہ لوگ ظاہر ہے خود تو شرکت نہ کر پائے تھے۔ مگر عبداللہ اور شارق کو

خاص تاکید کی تھی۔ اس لیے صبح اُسکو گیلری تک چھوڑ کر دونوں شادی پر چلے گئے۔ واپسی پر اُسکو ساتھ لیکر دونوں نے گھر واپس جانا تھا کیونکہ اگلے دن سحری کے وقت ابو نے پہنچ جانا تھا۔ اُنکے آنے سے پہلے وہ گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔

مگر کبھی کبھی اللہ کو کچھ اور ہی منظور ہوتا ہے۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے سبھی لوگ روانہ ہو گئے۔ بار بار اُسکی نگاہیں شیشے کی دیوار کے پار اتر رہی تھیں۔ اُسکو ساری شام میں جس کا انتظار رہا تھا۔ رات ڈھلنا شروع ہو گئی۔ اُسکو نہ آنا تھا نہ ہی وہ آیا۔ مگر ابھی تک رُباب عالم کی اُمید زندہ تھی۔ ہر دو سیکنڈ بعد خود کو تسلی دیتی۔ وہ آئے گا ضرور۔ کہیں ٹریفک میں پھنس گیا ہوگا۔ پھر اپنی سوچ کا جواب بھی خود ہی دیتی۔ بھلا ایسی بھی کیا ٹریفک جو ساری شام بیت جانے کے بعد بھی نہ کھل سکی۔ آخر کار گیلری کے گارڈ نے آکر اُسکو مخاطب کیا۔

”معذرت کے ساتھ بی بی پر مجھے یہاں تالا لگانا ہے۔ ورنہ آٹومیٹک آلارم سسٹم آن ہو جائے گا۔ آپ کے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔ اُس کے بعد اس عمارت کو خالی کر دیں۔“

اُس نے خوفزدہ نگاہوں سے گارڈ کو دیکھا۔ پھر باہر کھڑکی سے باہر پھیلے گھپ اندھیرے کو۔ سانس حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔

”کاش میں نے نائلہ کی آفر قبول کر لی ہوتی۔ اے کاش میں اُس کے ساتھ ہاسٹل چلی گئی ہوتی۔“

آنکھوں میں بھر آنے والی نمی کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس نے گارڈ کا پوچھا۔۔۔۔۔

”کیا یہاں کوئی فون کی سروس موجود ہے؟ اصل میں میرے فون کی بیٹری ختم ہونے پر فون بند ہو گیا ہے۔“

وضاحت دے دینے کے بعد اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بھلا اس آدمی کو یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ پر سامنے والے کے الفاظ نے تھوڑا حوصلہ دیا۔

”بہن یہاں پر فون کدھر ہوتا ہے۔ باہر دوسرے بازار میں پی سی او ہیں۔ پر رات کے ساڑھے گیارہ بجے تو وہ بھی بند ہو گئے ہونگے۔ پھر بھی آپ پتا کر سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کوئی کھلا ہوا ہو۔“

رُباب نے اثبات میں سر ہلایا۔ میز پر رکھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ ساتھ ہی وہ تصویر جو اُس نے آج خریدی تھی

اور مرے ہوئے قدموں سے باہر کو آ گئی۔۔۔

دروازہ کھول کر باہر آتے ہی۔ پنجاب کی ٹھنڈی ہواؤں نے پُرشوق استقبال کیا۔ بے اختیار اپنی چادر کو کانوں پر اور مضبوطی سے اوڑھتے ہوئے ایک نظر اطراف پر ڈالی۔ پارکنگ بالکل خالی پڑی تھی۔ جہاں شام میں اُس نے گاڑیوں کی بھیڑ اپنی گناہگار آنکھوں سے دیکھی تھی۔ رات کے وقت اکیلی اپنے کمرے سے نکل کر باہر والے ہاتھ روم تک نہ جانے والی زباب عالم اس وقت رات کے آخری پہرا کیلی اتنی انجانی جگہ پر موجود تھی۔ اس خیال کے آتے ہی آنسو اُٹ اُٹ آئے۔ چوکیدار بھی نہ جانے پچھلے راستے وہاں سے نکل گیا تھا کیونکہ گیلری کی ساری بتیاں گل ہو گئیں پر چوکیدار باہر نہیں آیا تھا۔

گیلری کے آگے موجود پارکنگ ایریا کی چار دیواری ہوئی تھی۔ زباب کی جرات نہ پڑی ایک قدم بھی بڑھا کر گیٹ کی جانب جانے کی۔ اسلیے وہیں بیٹھیوں کے پاس کھڑی ہو کر سامنے پڑی سنسان تارکول کی سڑک کو گھورنے لگی۔ اب تو ایک ہی سمت میں دیکھ دیکھ کر گردن اکڑ گئی تھی۔ خشک ہونٹوں پر زبان سے تری بکھیرتے ہوئے اُس نے آنسو صاف کئے۔ دل میں ذعائیں مانگ رہی تھی۔

”یا اللہ کوئی آجائے۔ کسی طرح سے یا بھائی کو بھیج دیں۔ یا شارق کو۔۔۔۔۔“

☆.....☆.....☆

پڑے کا آخری پیس چبا کر حلق سے نیچے پھینکتے ہی اُس نے کولے کا گلاس منہ کو لگایا اور ہٹایا تب جب سارا ختم ہو گیا۔ خالی گلاس میز پر رکھتے ہی وہ اپنے دوست کی ملامت کرتی نظروں کو نظر انداز کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا بھائی میں تو چلا۔۔۔ اتنے شاندار ڈنر کا شکریہ۔۔۔“

”تجھ جیسے بے غیرتوں کو ڈنر کرواتی ہے۔ میری جوتی۔۔ سالے مفت کے مال پر ہاتھ صاف کرنے کو ہر دفعہ کیسے خوشبو سونگھتے ہوئے آ جاتے ہو۔“

”بس جانے من یہ تو تمہاری محبت ہے۔ ادھر تم مجھے غائبانہ طور پر گالیاں دیتے ہو۔ ادھر میرے دل کی دھڑکن بے ہنگ ہو کر مجھے احساس دلواتی ہے۔ میرا دوست مجھ سے اُداس ہے۔ اُسی وقت حاضر ہو جاتا ہوں۔“

”دیکھ ڈنر تو تم نے کر لیا ہے۔ اب اگر سحرش کا نمبر نہ لیکر دیا تو میری طرف سے تم بھاڑ میں گئے۔“

ہوئی۔

وہ میسم کو ذاتی طور پر بالکل نہیں جانتی تھی۔ مگر یونیورسٹی میں اسکو کئی دفعہ دیکھ چکی تھی۔ وہ خود آرٹ پڑھ رہی تھی۔ مگر میسم بزنس ڈیپارٹمنٹ کا سٹوڈنٹ تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ اپنی ڈگری لینے کے آخری سال میں تھا۔ جبکہ زباب کے ابھی دو سال اور باقی تھے۔ مگر اس وقت ایک شناسا چہرہ سامنے دیکھ کر اس کو کچھ تسلی ضرور ہوئی تھی۔

”میرے گھر سے کوئی لینے نہیں آیا ہے۔ میرے فون کی بیٹری ختم ہے۔ اور یہاں کہیں فون بوتھ بھی موجود نہیں ہے۔“

”مس زباب یہ شورات نو بجے کا ختم ہو چکا ہے اور اس وقت پونے بارہ ہو رہے ہیں۔ اس تمام وقت میں تم یہاں سے کوئی رکشہ وغیرہ لیکر گھر کیوں نہیں گئیں؟“

”کیونکہ میرا گھر نارووال میں ہے۔ وہاں تک کبھی بھی میں اکیلی نہیں گئی ہوں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی لینے آتا ہے۔“

میسم کو شدید حیرت ہوئی۔ کوئی اس قدر غیر ذمہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ جس قدر اس لڑکی کے گھر والے غیر ذمہ داری دیکھا گئے تھے۔

”تم ہر روز نارووال سے آتی ہو؟“

”نہیں میں ادھر ہاسٹل میں رہتی ہوں۔ مگر آج کل ننھیٹی پر ہوں۔ خاص آج کے شو کے لیے ایک ہفتہ پہلے آئی تھی۔ آج واپس جانا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں کوئی لینے نہیں آیا۔ کیا میں آپ کے فون سے اپنے گھر فون کر کے پتا کر سکتی ہوں؟“

میسم کو خواہ مخواہ کی شرمندگی نے گھیرا۔

”افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے۔ مس زباب مگر اس وقت میرے پاس فون نہیں ہے۔“

زباب کی آنکھیں بے یقینی و مایوسی سے پھیل گئیں۔

”آج کل ہر لڑکے لڑکی کے پاس فون ہوتا ہے۔ آپ کے پاس کیوں نہیں ہے؟“ وہ نہ جان سکی مگر اسکی

آواز میں ہلکا سا غصہ تھا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ مس زباب فرسٹ آف آل کونے ماں باپ ہیں۔ جن کو یاد ہی نہ رہے کہ اُنکی جوان بیٹی اکیلی آدمی رات کو ایسی ویران جگہ پر تنہا بیٹھی اُنکا انتظار کر رہی ہے۔“

”میرے امی ابو کا قصور نہیں ہے۔ مجھے لینے آنے کی ذمہ داری میرے بھائی اور منگ۔۔۔۔۔ کزن کی تھی۔“
مگنیتر کہتے کہتے بیان بدل گئی۔ سامنے والے نے محسوس کیا یا نہیں بس بولا۔
”اب تم یہاں بیٹھ کر مزید انتظار کرنا چاہتی ہو۔ یا میری مدد چاہیے؟“

”آپ بھلا میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟“
”اگر لاہور میں کوئی رشتے دار ہیں۔ تو اُنکے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ وہاں سے اپنے گھر والوں سے رابطہ کر لینا۔“

”یہاں میرے کسی رشتے دار کی رہائش نہیں ہے۔ البتہ میری کزن کی خالہ فاطمہ گ میں ہوتی ہیں۔ پر وہاں میں ایسے نہیں جاسکتی۔ نہ جانے مجھے ایک غیر لڑکے کے ساتھ دیکھ کر وہ کیا سوچیں۔ اگر آپ کو نہ اُنہ لگے تو مہربانی کر کے مجھے میری کزن کے ہاسٹل تک چھوڑ دیں۔“
”میرا نہیں خیال ہاسٹل والے تمہیں اندر جانے دیں گے۔ خاص کر لڑکیوں کے ہاسٹل کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔“

”دیکھئے میرے پاس اس وقت یہی ایک راہ ہے۔ آپ وہاں تک پہنچا دیں۔ آگے میری کزن کوئی نا کوئی حل نکال لے گی۔“

میسم نے کندھے اُچکائے۔۔۔ اور آنے کا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔
موٹر سائیکل موڑ کر جب تک مطلوبہ سمت کی جانب کی زباب باہر آ گئی۔ پر اُمید نظریں ابھی بھی راستے پر جمی تھیں۔

”بیٹھو بھی۔۔۔۔۔“

زباب کس دل سے اُس لڑکے کے پیچھے بیٹھی تھی۔ اُسکا اللہ خوب جانتا تھا۔ پھر بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر اُس

نے خریدی ہوئی پینٹنگ کا فریم اپنے اور میسم کے درمیان رکھا۔ پھر خود بیٹھی۔ اپنی چادر کا پلو اچھی طرح لپیٹ کر گود میں رکھنے کے بعد سیٹ کو نیچے سے زور سے پکڑ لیا۔ آج شاید دونوں سواروں کے ستارے گردش میں تھے۔ ابھی وہاں سے ایک سڑک کر اس کر کے آگے بڑھے تھے۔ جب پولیس پیڑول نے روک لیا۔ رُباب کی تواو پر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے رہ گئی۔ پہلے ہی چھکے چھوٹے ہوئے تھے۔ اب تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ جو کوئی کمی رہ گئی تھی میسم کی تلاشی کے دوران اُسکی جیب سے نکلنے والی پاؤڈر کی پڑی نے پوری کر دی۔

پولیس والوں نے نہ تو میسم کی صفائیاں سنی نہ رشوت کی آفر قبول کی کیونکہ اُس وقت دونوں کے پیسے ملا کر صرف پندرہ سو ہی ہوا۔ انہوں نے موٹر سائیکل اپنے قبضے میں کر کے اُن دونوں کو زبردستی پولیس وین میں بیٹھا دیا۔ رُباب گھٹی گھٹی سسکیوں کیساتھ روتے ہوئے باقاعدہ طور پر کانپ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ غصے سے پولیس والوں کے ساتھ بحث کرنے کی کوشش میں تھی۔ مگر اب بے بسی سے فقط رونے پر ہی زور چل رہا تھا جبکہ اُس کے سامنے والی سیٹ پر میسم سر ہاتھوں میں تھا مے ابھی تک بے یقین بیٹھا تھا۔ خود کو کوس بھی رہا تھا۔ کیوں میں سڑک سے آنے کی بجائے گلیوں میں سے ہوتا ہوا آ گیا۔

اب نہ تو اپنی جیب میں فون تھا۔ نہ پولیس والوں نے فون کرنے کی اجازت دی۔ بس اُن دونوں کے کوائف لے لیے تھے۔

میسم نے اپنے والد کا نمبر لکھوا دیا تھا۔

رُباب کا تو یہ سوچ کر ہی دل ڈوب رہا تھا۔ کس منہ سے ابو کا سامنا کرے گی۔ اور وہ تو یہ خبر سن کر کہ بیٹی تھانے میں ہے۔ نہ جانے کیا کر دیں گے۔ اُس نے اپنے بھائی کا نمبر دیا تھا۔ جس کو نہ جانے اُس وقت سے کتنی دفعہ دل میں بُرا بھلا کہہ چکی تھی۔ جو اگر وقت پر اُسے لینے آ گیا ہوتا تو یہ سب تو نہ ہوتا نا۔۔۔۔۔

”پلیز انکو بولیں میرے کانوں کے ٹاپس اور یہ پینڈٹ بھی رکھ لیں۔ مگر مجھے جانے دیں۔“

”مس رُباب تمہارے سامنے ہے۔ میں نے ان کو منانے کے لیے کتنی منتیں نہیں کی ہیں۔ اب کیا پیر پڑ جاؤں۔ تمہارے گھر والوں کی لا پرواہی کی بھیینٹ میری آج کی رات بھی چڑھ گئی ہے۔ ساتھ میں ایک لڑکی کو آدمی رات میں لیکر گھومنے کا الزام مفت میں لگ گیا ہے۔ اب بس صبر کرو۔ میرے بابا کو فون جانے کی دیر ہے۔“

وہ یہاں ہونگے۔۔۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

رُباب نے گرلاتے دل سے پوچھا تھا۔

کیا واقعی اب کبھی سب کچھ ٹھیک ہوگا؟ جواب فوراً سے آ گیا تھا۔ اب شاید کبھی بھی کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ گاڑی صدر تھانے کے سامنے زکی توڑ باب نے آنکھیں میچ لیں۔ کئی موتی ٹوٹ کر گر گئے۔ وہ جس خاندان کی عورتوں نے کبھی دن کی روشنی میں تھانے پتھر یوں کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اُس گھر کی بیٹی ایک اجنبی مرد کی معیت میں آدھی رات کو تھانے لائی گئی۔

وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی مجرموں کی طرح ایک سنگی بیچ پر اکڑ کر بیٹھی یہی ڈعا کرتی رہی۔ یا اللہ اس رات کا دن نہ نکلے۔ مجھے رات کی سیاہی ختم ہونے سے پہلے ہی اٹھالیں۔ بعض اوقات انسان کی آزمائش ہوتی ہے یا سزا۔۔۔ دعائیں مستعجاب نہیں ہوتی ہیں۔ یا شاید سنبھال کر رکھ دی جاتی ہیں۔ کسی اور وقت کے لیے۔ رُباب عالم کو تو آج ضرورت تھی۔ اُس نے ساری رات روتے اور ڈعائیں کرتے گزاری۔۔۔۔

دن نکلنے سے پہلے ہی لیڈی کانشیبل نے آ کر اپنی کرخت آواز میں اُسکو متوجہ کیا۔

”چلو لڑکی تمہارے گھر والے آ گئے ہیں۔“

مگر رُباب کی ٹانگیں اُسکا وزن اٹھانے سے انکاری ہو گئیں۔

”کون آیا ہوگا؟ ابو جی؟؟ یا اللہ باہر ابو نہ آئے ہوں۔ یا اللہ اُنکا سامنا کروانے سے پہلے یہ سانس کھینچ

لے۔ میں اُنکا سامنا نہیں کر سکتی۔ میں کسی کا بھی سامنا نہیں کر سکتی۔ مجھے خود اپنے آپ سے بھی شرم آ رہی ہے۔“

”اٹھو بھی باہر تمہارے باپ کے نوکر نہیں ہیں۔ جو دن چڑھنے تک انتظار کرتے رہیں گے۔ رنگ رلیاں

منانے سے پہلے کیوں نہیں سوچتی ہو۔ جب یار کے ساتھ پکڑی جاتی ہو۔ تب تمہیں خاندان اور بے عزتی یاد آتی

ہے۔ ہم روز ادھر یہی ڈرامے دیکھتے ہیں۔ اب آؤ جلدی کرو۔“

وہ مزید اس عورت کا ایک لفظ نہیں سنتا چاہتی تھی۔ اس لیے ہمت کر کے اُس کے پیچھے چل پڑی دوپٹے کے پلو

سے چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔

تھانے کا سارا احاطہ پار کر لیا۔ کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آیا۔ ابھی بیرونی گیٹ سے باہر ہی نکلی تھی۔ جب میسم

ایک گاڑی سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا اسکی جانب آیا۔

”تم ٹھیک ہو؟ ایم سوری میرے یا میرے والد کے کہنے پر انہوں نے غور نہیں کیا۔ میرے ابو تو اسی وقت ایک گھنٹے بعد آ گئے تھے۔“ وہ اسکی آواز تو سن رہی تھی۔ مگر کوئی بھی لفظ سمجھ نہ آرہا تھا کیونکہ اسکی پتھرائی ہوئی نظریں ہوٹل اسوک کی کھڑکی سے نظر آتے اپنے ابو کے چہرے پر تھیں۔ وہ لڑکھڑائی۔ کیونکہ اسکو دیکھتے ہی ابو نے نظر دوسری جانب پھیر لی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر چاچو باہر نکلے اور اس کے لیے پچھلا دروازہ دیا۔ وہ نہ جانے کیسے چلتے ہوئے وہاں تک پہنچی تھی۔ کیونکہ دماغ کی سلیٹ بالکل صاف ہو گئی تھی۔ آنکھیں بھرائی ہوئی تھیں۔ نظریں زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔

لیڈی کانشیبل نے چاچو سے کچھ کہتے ہوئے پیچھے گیٹ کے پاس کھڑے میسم کی جانب اشارہ کیا تھا۔ جس پر انہوں نے گردن موڑ کر ایک اچھتی سی نظر اس پر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھادی۔ سارا راستہ گاڑی میں گہری خاموشی کا راج رہا۔ وہ پچھلی سیٹ پر گھڑی بنی بیٹھی کانپ رہی تھی۔ آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔ دل چاہ رہا تھا۔ بات کرے، بتائے کہ میرا قصور نہیں ہے۔ عبداللہ اور شارق کی خبر لیں۔ سارا قصور اُنکا ہے۔ مگر زبان ساتھ دیتی تب تھا۔

گاڑی گاؤں میں داخل ہی ہوئی تھی۔ جب ابو کے کہنے پر چاچو نے گاڑی روکی۔ ابو گاڑی سے نکل گئے۔ چاچو نے گاڑی آگے بڑھادی۔

ساتھ ہی انہوں نے بیک ویو مرر سے اسکو دیکھا۔ جس کی دوپٹے میں سے صرف آنکھیں ہی جھانک رہی تھیں۔ وہ بھی اس وقت پہچانی نہیں جا رہی تھیں۔ رورو کر لال تو ہوئی ہی تھیں۔ پر سوج کر گیند بھی بنی ہوئی تھیں۔ اُن کے دل کو کچھ ہوا۔ اتنی پیاری معصوم سی اُنکی بھتیجی تھی۔ بھلا وہ یہ سب کیسے کر سکتی ہے۔ پولیس والوں نے عبداللہ کے فون پر کال کر کے اطلاع دی تھی۔ اور عبداللہ اتنا حواس باختہ ہوا کہ پولیس والے کو سیدھا ابو کا نمبر دے دیا جو ابھی اوکاڑہ سے واپسی پر راستے میں ہی تھے۔

پولیس نے انکا نام وغیرہ تصدیق کرنے کے بعد کہا۔
”جناب آپکی کوئی بیٹی ہے۔ جسکا نام زباب عالم ہو؟“

ابو جی بھر کر حیران ہوئے۔ بیٹی کو وہ گھر پر صبح سلامت چھوڑ کر آئے تھے۔ اُس کو کیا ہو گیا جو یہ پولیس اُن سے رابطہ کر رہی ہے۔ مگر اگلی خبر سن کر ایسا لگا۔ جیسے پورا کا پورا آسمان اُنکے سر پہ آگرا ہو۔

”جناب آپ کی بیٹی لاہور کے ایک گنجان آباد علاقے سے ایک لڑکے کے ساتھ موٹر سائیکل پر جاتی ہوئی پکڑی گئی ہے۔ اُن دونوں کے پاس سے نشہ آور چیزیں بھی برآمد ہوئی ہیں۔ آپ آ کر انسپکٹر صاحب سے ابھی ہی مل لیں۔ ورنہ صبح ہو گئی تو اچھی بات نہیں ہوگی۔ نام وغیرہ سے تو آپ کوئی زمیندار آدمی معلوم ہو رہے ہیں۔ رہتے بھی گاؤں میں ہیں۔ وہاں تو ایسی باتوں کو حد سے زیادہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ دن کی روشنی میں کسی نے آپ کی بیٹی کو حوالات سے نکلنے دیکھ لیا۔ خواہ مخواہ آپ کا جینا محال ہو جائے گا۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔“

وہ اُس کو درمیان میں ٹوک کر سختی سے بولے۔ ”کس تھانے میں آنا ہے؟“

”وہ جی صدر تھانے میں جناب اور کچھ خرچہ پانی بھی لیتے آئیے گا۔ کام جلد اور آسانی سے ہو جائے گا دیکھیے نا اس وقت یہاں اخبار والے بھی سنسنی خبریں ڈھونڈتے ہوئے آتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ تصویر اور خبر لگ گئی تو ملک کے ہر چینل پر کل کو یہی بات گھوم رہی ہونی ہے۔ آپ تو سیانے آدمی ہیں۔ جانتے۔۔۔۔۔“

مزید سننے کی تاب نہ لاتے ہوئے اُنہوں نے فون بند کر دیا۔ اُنکی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر گود میں گرا تھا۔ تھانے پہنچ کر اُنہوں نے بھاری رقم دیکر سارے منہ بند کئے اور اُس کو لیکر آئے تھے۔ اُنہوں نے تاسف بھری نظر اُسکے جھکے سر پہ ڈالی اور ڈکھ سے بولے۔

”زباب پتھر جو آج ہوا ہے۔ وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

اُس کو جیسے تھوڑا سا سہارا ملا۔۔۔ پھر سے رونا شروع ہو گئی۔ مگر اُس کو لگا کسی کو توجہ بتا کر مدد مانگنی چاہیے۔ نہ جانے شارق اور عبداللہ نے گھر پر کیا کہانی سنائی ہو۔ نہ جانے اُن لوگوں نے ابو کو کس انداز میں بتایا ہو۔ ورنہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا ہے۔

”چاچو میری تصویروں کی نمائش تھی۔ جس کے ختم ہونے پر شام نو بجے شارق اور عبداللہ نے مجھے وہاں سے لیکر آنا تھا۔ چاچو میں نے رات کے گیارہ بجے تک وہاں اکیلے بیٹھ کر اُن دونوں کا انتظار کیا تھا۔ پر وہ نہیں آئے۔“

”آہستہ آہستہ اُس نے ساری حقیقت کھول کر بیان کر دی۔ چاچو تھوڑا مطمئن نظر آئے مگر جو نبی گھر پہنچے سارا

اطمینان جاتا رہا۔ وہاں پر چچی باقاعدہ اونچی اونچی آواز میں بین کر رہی تھیں۔ زباب کی امی نے بھی رو رو کر اپنا حشر کیا ہوا تھا۔

چچا تو جاتے ہی شارق اور عبداللہ پر ٹوٹ پڑے۔ اُن کو چھڑی سے مارتے ہوئے گالیاں دیں۔ اپنی بیوی کی عادت سے وہ بخوبی واقف تھے۔ جس کے علم میں یہ بات آگئی تھی۔ تو اسکا مطلب تھا۔ سارے خاندان کو اب تک فون ہو چکے ہوں گے۔ اسی بات کا غصہ انہوں نے شارق اور عبداللہ پر اتارا۔

مگر چچی نے چچا کا ہاتھ درمیان میں ہی روک لیا اور آنکھوں میں چیلنج لیکر اُنکے سامنے ڈٹ گئیں۔
”اپنی بھتیجی کو مارو جو نہ جانے کس کے ساتھ منہ کالا کرتی پکڑی گئی ہے۔ ہماری بھی تو بیٹیاں کالجوں میں پڑھتی ہیں۔ آج تک سنی کوئی اُنکی بات؟ اس لڑکی کے ہمیشہ سے ہی سارے شوق نرالے رہے ہیں۔ کبھی کیمرہ اٹھا کر تصویروں کے بہانے گاؤں کی گلیوں میں گھوم رہی ہے کبھی برستی بارش میں کیمرہ اٹھا کر گھر سے نکل جاتی ہے۔ آج آگیا سارا کچھ کھل کر سامنے اچھا ہوا جو میرے بیٹے کی زندگی تباہ ہونے سے پہلے ہی اسکے کرتوت کھل گئے ہیں۔“

وہ شروع ہوئیں تو نہ جانے کیا کیا بولتی چلی گئیں۔ زباب کا کل رات کا تھکا دماغ اور بھوکا پیاسا وجود مزید برداشت نہ کر سکا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آیا اور وہ وہیں ماربل کی سیڑھیوں پر ڈھیر ہو گئی۔ گرنے کی وجہ سے پہلی سیڑھی کا کونا اسکے ماتھے پر لگا تھا۔ جس سے خون کی دھار بہنے لگی۔
چچی نے ایک نظر دیکھا۔ اور حقارت سے بولی۔

”چلو نبیلہ بہن تیاری کر رکھو کیا پتا تم نانی بننے والی ہو۔“

اُنکی اس بات پر چچا کا ہاتھ اٹھا اور اُنکے چہرے پر نشان چھوڑ گیا مگر جس کے لیے یہ سب کہا جا رہا تھا۔ وہ اس وقت ہر تکلیف سے منہ موڑ کر سیڑھیوں پر اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اُسکو بس ایک ہی بات پر غصہ آیا تھا۔ اُسکی ساری رات برباد ہو گئی۔ آج کل اُسکے پیپر قریب تھے۔ اسلیے راتوں کو جاگ کر وہ تیاری کر رہا تھا۔ تاکہ پیپر والے دن بس سرسری سا سارا کچھ ایک دفعہ دیکھ لیا جائے اور ہر

دفعہ یہی اُسکی روٹین ہوتی تھی۔ جونہی یونی والے فارغ کرتے وہ اپنی تیاری کے لیے ٹائم ٹیبل بنا لیتا۔ راتیں میوزک سننے کے ساتھ ساتھ پڑھائی میں گزرتیں اور دن کو کھوتے گھوڑے سب کے سب بچ کر سو رہا ہوتا۔
ابو اسکو لینے آئے۔ ساری بات کلیئر کرنے کے بعد وہ اسکو لیکر گاڑی تک آئے۔ تو اس نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا۔

”ابو کیا ہم تھوڑی دیر یہاں رُک کر انتظار کر سکتے ہیں۔ جب تک اُس لڑکی کے گھر سے کوئی نہیں آ جاتا۔“
”تمہارے سامنے ہی تو تھا نیدر سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے فون کر دیا ہوا ہے۔ وہ لوگ آ جائیں گے۔ مگر مجھے کل آفس بھی جانا ہے۔ پہلے ہی اتنے لیٹ ہیں۔“
”پھر آپ گھر چلے جائیں۔ میں اپنی موٹر سائیکل پر آ جاؤں گا۔ دیکھیں نا وہ میری یونیورسٹی فیلو ہے۔ ایسے چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگتا۔“
”ہاں میں تمہیں چھوڑ جاؤں تاکہ پھر کوئی پنگا کر دو۔ ٹھیک ہے اگر تمہارا زکنا اتنا ہی ضروری ہے۔ تو ہم اس بچی کے گھر والوں کے آنے تک انتظار کر لیتے ہیں۔ پراگروہ صبح دن چڑھنے تک بھی نہ آئے تو پھر۔۔۔۔۔۔“
”پھر کیا کہہ سکتے ہیں۔ زکنا تو ادھر ہی پڑے گا۔“
”یعنی تمہارے دماغ میں مدد کا خناس بھر چکا ہے۔ تو مجھے ریلیکس ہو جانا چاہیے۔ میرا نہیں خیال دن نکلنے سے پہلے ہم گھر جا پائیں گے۔“

طلال نے اپنی سیٹ پیچھے کو سیدھی کی اور سینے پر ہاتھ باندھ کر آنکھیں موندھ لیں۔ وہ نیند کے پکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اُنکے خزانے کو بچنے لگے۔ میسم اگلے تین گھنٹے تک تھانے کے باہر ہر آنے جانے والی گاڑی کا جائزہ لیتا رہا۔

پھر ایک گاڑی آئی جس میں سے نکلنے والے فرد کو دیکھتے ہی وہ جان گیا تھا۔ یہی زباب عالم کے لیے آئے ہیں۔ گاڑی کی فرنٹ پیئجریٹ پہ موجود فرد گاڑی سے باہر ہی نہیں آیا تھا۔ صرف ڈرائیونگ سیٹ سے نکلنے والا درمیانی عمر کا مرد اندر تھانے میں گیا۔ پندرہ منٹ بعد واپس آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ تین منٹ بعد میسم نے زباب کا چہرہ گیٹ میں اُبھرتا دیکھا تو فوراً باہر آیا۔

اُس نے بات کرنا چاہی مگر زباب کوئی بھی رد عمل دیکھائے بغیر آگے بڑھ گئی۔ اُسکا چہرہ تو ڈھانپا ہوا تھا۔ مگر وہ اُسکے قدموں کی لڑکھڑاہٹ محسوس کر سکتا تھا۔ وہ جا کر گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ وہاں کھڑا ہو کر دور جاتی گاڑی کی بیک لائٹ کو دیکھتا رہا۔

پھر اپنی گاڑی کے ہارن بجنے پر متوجہ ہوا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔
 ”دیکھ لیا اب سکون ہو گیا۔ کیا اب ہم گھر جاسکتے ہیں؟ جا کر تم نے اپنی ماں سے سروس کروانی ہے۔ اور ساتھ ساتھ مجھے بھی سنواؤ گے۔“
 ”عجیب لڑکی ہے۔ میں اسکی مدد کرنے کے چکر میں یہاں پھنس گیا اُس نے دو منٹ زک کر بات بھی نہیں سنی۔ بھلائی کا یہ حال ہوتا ہے۔“

”چلو اُسکو چھوڑو اب اپنی اماں کی سوچو۔۔۔۔۔“
 ”تو کیا ہے۔ آپ میرے لیے اپنی بیوی سے تھوڑی سی ڈانٹ نہیں کھا سکتے ہیں۔“
 طلال احمد نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اُسکو گھورا۔۔۔
 ”شرم نہیں آتی۔ یہ ڈرگزر والا کیا چکر تھا۔ جانتے ہو تم جیل بھی جاسکتے تھے۔“
 ”بے فکر رہیں مجھے علم تھا۔ آپ مجھے یہاں چند کھنڈے نہیں رہنے دیں گے۔ جیل جانا تو بہت دور کی بات ہے۔“

”ہاں پر جانتے ہو۔ کبھی کبھی اچھے سے اچھا وکیل بھی آپ کے کام نہیں آتا۔ اسلیے انسان کو زندگی مختاط ہو کر ہی گزارنی چاہیے۔ اب بتاؤ ڈرگزر کہاں سے آئے؟“
 ”ایک دوست کے تھے۔ کل ایویں میری جیب میں رہ گئے۔ آئندہ خیال کروں گا۔“
 ”کرنا بھی چاہیے۔ اب اپنی ماں کو ساری بات میں سے ڈرگزر نکال کر تفصیل بتانا ورنہ اگلی ساری عمر نشے کے طعنے سنتے گزرارو گے۔“

”میں تو کچھ بھی بتانے کی حالت میں نہیں ہوں۔ اتنا تھکا ہوا ہوں۔ جاتے ہی سونا چاہتا ہوں۔ البتہ آپ اُنکو سب بتا سکتے ہیں۔“

”بڑے ہی مطلبی ہو۔“

”جی بھلائی کا بھی تو زمانہ نہیں ہے۔“

اُسکا اشارہ سمجھ کر طلال احمد مسکراتے لگے۔

دن کو وہ سو کر اٹھا تو ساری بات بھول چکا تھا۔ وہی روٹین کے کام شروع ہو گئے۔

یہ تو ایک ہفتے بعد کی بات ہے۔ جب اُسکے کچھ دوست اُسکی طرف آئے۔ جنکو اُس نے شاندار سالنچ گھر پر ہی کروایا۔ کھانے کے بعد بیٹھے سب کہیں ہانک رہے تھے۔ جب ایک نے اچانک تذکرہ چھیڑا۔۔۔

”میسیم تم نائلہ کو جانتے ہو۔۔۔؟“

”بہت ساری نائلہ نامی لڑکیوں کو جانتا ہوں۔ اب نہ جانے تم کس والی کا پوچھ رہے ہو۔“

فیصل جو بظاہر ادگھ رہا تھا۔ فٹ بولا۔

”ماشا اللہ ہر نائلہ، شائلہ، کریلا کا حد و دار بلج بھائی نے زبانی رٹا ہوا ہے۔“

کمرے میں قہقہے گھونجے جبکہ میسیم نے ایک ٹشن سے رکھ کر نشانہ فیصل کے سر پر مارا۔

جواب میں وہ کراہا۔

”کینے سر میں مارنا ضروری تھا۔ میری ساری نیند بھگادی۔“

تیسرا تیزی سے درمیان میں چینا۔

”یار میں یہاں ایک بڑی سنجیدہ بات کرنے لگا تھا۔ تم لوگوں نے اپنا بھنڈ خانہ شروع کر دیا۔“

”جی جی مولانا فرمائیے ضرور اُس نائلہ کا فون نمبر چاہیے ہوگا۔“

فیصل کی بات پر وہ بولا۔

”ہر کسی کو اپنے جیسا نالائق نہ سمجھا کرو۔ نمبر ہم خود براہ راست مانگ لیتے ہیں۔ تمہاری طرح گرو جی کی مدد

سے نہیں۔“

فیصل کی شکل دیکھنے والی تھی۔ منہ بنا کر بولا۔

”اللہ کرے تم سب کے فون یا تو پانی میں گر جائیں یا ساری کاٹمیٹ میموری ڈیلیٹ ہو جائے۔“

”پھر کیا ہوتا ہے؟ اپنے مطلوبہ نمبر ہم نے دل پر لکھے ہوئے ہیں۔“

شہباز کی بات پر ساری ٹیم ہنس ہنس لوٹ پوٹ ہو گئی۔

میمم نے شہباز کی توجہ واپس نائلہ کی جانب کروائی۔

”ہاں تو کس نائلہ کی بات کر رہے تھے۔ اور کیوں؟“

”بھائی وہ جو فوٹو گرافرز باب عالم کی کزن ہے۔“

اب میسم کی ساری توجہ شہباز پر تھی۔

”ہاں جانتا ہوں۔ اُسکو کیا ہوا؟“

”یار وہ میری کزن کی دوست ہے۔ اور میرے کان میں تیرے اور زباب عالم کے حوالے سے ایک بات

پڑی ہے۔ اب میں نہیں جانتا کس قدر سچ ہے۔ پر جو نیوز میں یہ بات ساری پھیلی ہوئی ہے۔“

میمم کے علاوہ باقی تینوں بھی شہباز کا منہ دیکھ رہے تھے۔ فیصل سے زیادہ انتظار نہیں ہوتا تھا۔

”اوئے بھائی بک بھی دئے۔ کیا سنسن پھیلا کر بچوں کی جان لیتی ہے۔“

”یار بات کرنے سے پہلے میں ایک بات صاف کر دوں۔ مجھے اس ساری کہانی پر ذرا یقین نہیں ہے۔“

کیونکہ زباب عالم کو بھی دیکھا ہے۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔ اور اپنے بھائی سے کون واقف نہیں۔ پر زباب کی کزن

نے میری کزن کو یہ بتایا ہے۔ جس دن گیلری میں ہم لوگ نمائش دیکھنے گئے تھے۔ اُس رات کو یہ دونوں ڈیٹ پر

تھے۔ جہاں پر پولیس نے دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔“

کمرے میں کتنی دیر تک تو خاموشی چھائی رہی۔ پھر سب سے پہلے فیصل نے قہقہہ مارا۔

”پیارے کیا لطیفہ سنایا ہے۔۔۔“

دوسرا ایک بولا۔

”کیسی فضول بکواس ہے؟“

میمم کی خاموشی پر سب ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے کے بعد اُسکو گھور رہے تھے۔ فیصل نے

پہل کی۔

”حضور آپ کیوں شکل سے گلٹی گلٹی سے نظر آ رہے ہیں۔ کیونکہ اتنا تو میں جانتا ہوں۔ اُس رات کا ڈنرٹو نے میرے ساتھ کیا تھا۔ اور جب میرے گھر سے گئے تھے۔ اُس وقت کونسا ڈیننگ سپاٹ کھلا ہوتا ہے۔ جہاں تک رہی زباب کی بات وہ تو بچاری شکل سے ہی اللہ کی بندی معلوم ہوتی ہے۔ اُس وقت اپنے گھر آرام سے سو رہی ہوگی۔ پر یہ نالکہ بڑی خراب لڑکی ہے۔ کیسی افواہیں پھیلا رہی ہے۔“

”اُس دن زباب میرے ساتھ تھی اور ہم لوگوں کو پولیس نے پکڑا تھا۔“

اب وہ چاروں کے چاروں منہ کھولے آنکھیں پھاڑے اُسکو ایسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے اچانک سے میسم کے سینک نکل آئے ہوں۔

اُس نے اُنکی شکلیں دیکھیں اور آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

”بہت بہت شکریہ بے غیر تو۔۔۔ ایسے دیکھ رہے ہو۔ جیسے میں نے قتل کا اعتراف کر لیا ہو۔ ظاہری بات ہے جو کچھ اُس واقعے کے بارے میں پھیلا یا گیا ہے۔ وہ سب بہتان ہے۔ سچ بالکل مختلف ہے۔ میں تو اتنے دنوں سے یہ بات سرے سے بھول ہی چکا تھا۔ ابھی تم نے ذکر کیا تو یاد آئی ہے۔“

”میسم طلال حقیقت پر روشنی ڈالوں ورنہ مجھے ہارٹ اٹیک ہونے والا ہے۔“

اُس نے فیصل کو گھورا۔

”اگر اتنی جلدی میں ہو تو پہلے تم مر ہی جاؤ۔ سچائی میں تمہاری قبر پر آ کر بتا جاؤنگا۔۔۔“

فیصل بالکل بھی بد مزہ نہیں ہوا۔ میسم نے مختصر سا اُس روز کا واقعہ بتا دیا۔

”یار انتہا کہ جہالت ہے۔ دو لوگ ایک ساتھ نظر کیا آجائیں۔ اُنکو بدنام کر دیا جاتا ہے۔ کوئی سچائی جاننے کہ کوشش نہیں کرتا۔ اگر کوئی عادی مجرم ہو۔ اُسکی تو الگ بات ہے۔ مگر جو لوگ اپنی راہ سیدھی رکھنے والے ہوں۔ اُنکے بارے میں منہ کھولنے سے پہلے بندہ کوئی خُدا کا خوف ہی کر لیتا ہے۔ یہ بات تقریباً یونی کے ہر جو نیر کو معلوم ہے۔ ایک دوسرے کو بڑھا چڑھا کر بتا رہے ہوتے ہیں۔ مجھے سچی میں زباب کے لیے افسوس ہو رہا ہے۔ وہ بچاری تو یہ سب ڈیز رو نہیں کرتی۔“

شہباز کی بات پر سب نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیئے۔ وہ چاروں ہی انتہائی لائق لڑکے تھے۔ کسی

قسم کی فضول سرگرمی میں کم ہی نظر آتے۔

”اوپر سے انتہائی ہے۔ نائلہ کے بھائی کی شادی زباب کے ساتھ ہونا تھی۔ پر اب ان لوگوں نے منگنی توڑ دی ہے۔ کیونکہ زباب کا کردار مشکوک ہو گیا ہے۔“

میسم غصے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا۔

”واٹ داہیل مین۔۔۔!! ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا ہے۔ اُس میں اُسکا کردار کہاں سے آ گیا۔ ہمارے لوگوں کو ناؤ ذہنی طور پر بڑا ہونے کی ضرورت ہے۔ ویسے تو یہ نائلہ بی بی اتنی بڑی یونیورسٹی سے تعلیم لے رہی ہے۔ پر اندر سے تو نری شیطان ہے۔ جس کا تعلیم بھی کچھ نہیں بگاڑ سکی۔“

”صدافسوس۔۔۔ اور کیا کہا جائے۔“ قیصر نے اپنی رائے دی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

وہ سب میسم کے بیڈروم میں موجود تھے۔ وہ اس وقت دروازے کے قریب ہی تھا۔ ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا۔ سامنے ملیجہ کھڑی تھی۔

اُس نے بہن کو دیکھ کر بھنویں اچکائے۔۔۔

”شہباز بھائی کی امی کا فون تھا۔ کہہ رہی تھیں۔ جوتا لیکر آ رہی ہیں۔ تب تک میسم کو بولو اپنے نکلے دوست کو پکڑ کر رکھے۔ خردار جو میرے آنے تک اُسکو ہلنے دیا۔“

شہباز اپنے سر پہ ہاتھ مارتا بولا۔

”مروادیا ناں۔ ایک تو تم اپنے کمرے میں کلاک نہ لگانا۔ ادھر آ کر بندہ ویسے ہی وقت کی رفتار بھول جاتا ہے۔ امی نے کہا تھا۔ پانچ بجے میں اُنکو ماموں کی طرف سے اٹھالوں۔ کیونکہ انہوں نے آنکھیں دیکھانے جانا ہے۔“

شہباز اٹھ کر جوتے پہنے کے ساتھ ساتھ اُن لوگوں کو بتاتا جا رہا تھا۔ اینڈر فیصل کے کندھے پہ تھکی ماری۔

”چل میرے ساتھ رات کو تجھے گھر ڈراپ کراؤں گا۔“

”تم نے امی کے ساتھ جانا ہے۔ میں وہاں کیا کروں گا۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ وہاں کافی وقت لگتا ہے۔ میں اکیلا بور ہو جاتا ہوں۔ چل کمپنی رہے گی۔ ادھر

رہسپشن پہ جوڑ کی بیٹھتی ہے۔ ہو بہو سحرش کی کا پی ہے۔“

فیصل اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی کہنا نہ بھولا۔

”سحرش صرف ایک ہے۔ اُسکے بعد اللہ نے اُس جیسی اور نہیں بنائی۔“

پیچھے سے کسی کی زبان پر کھلی ہوئی تھی۔

”وہ ایک بھی دھرتی پر بوجھ ہے۔“

فیصل کا بازو شہباز کے ہاتھ میں تھا۔ جو اسکو گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ فیصل نے پیچھے مڑ کر غداری کرنے والے کو گھورتے ہوئے کہا۔۔

”شرم کر بے غیرت وہ تیری ہونے والی بھابھی ہے۔“

اُن دونوں کے بعد دوسرے بھی کھڑے ہو گئے۔ سب کو نیچے گیٹ تک چھوڑنے کے بعد وہ لان کی کرسی پر بیٹھ کر شہباز کی کبھی باتوں پر غور کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ آیا اس موضوع کے بارے میں گھر ہر بات کی جائے یا نہیں۔ مگر ابو کی گاڑی کے ہارن نے اُسکو سوچوں سے باہر نکالا۔۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب بھول کر اپنے کمرے میں کتابوں میں گم ہو چکا تھا۔

دوسرے دن ابھی اٹھ کر نہانے کے ناشتہ کرتھا۔ جب دماغ میں ایک کوندا سا لپکا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اندر آیا۔ کی سٹینڈ سے اپنی موٹر سائیکل کی چابی لی۔ گاڑی پہ جانا آئیڈیل ہوتا مگر گاڑی اُسکی دو ہفتوں سے ورکشاپ پر کھڑی تھی۔ اُسکا انجن بیٹھ گیا تھا۔

”امی میں ذرا فیصل کی جانب جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ آنے میں تھوڑا لیٹ ہو جاؤں۔“

وہ کروڑوں سے ملیجہ کہ بیڈ شیٹ بنا رہی تھیں۔ ہاتھ روک کر بیٹے پر نظر ڈالی۔ کالی شلوار قمیض میں اونچا لمبا سراپا سفیدی مائل رنگ سر پر بھاری بالوں کا جنگل دل ہی دل میں اُسکی نظر اتاری۔

”ابھی کل تو وہ گیا تھا۔ اتنی جلدی اُداس ہو گئے ہو۔“

”بس ایک کام یاد آ گیا ہے۔ آپ ابو کو بتا دینا۔ اوکے اللہ حافظ۔۔۔“

مزید کچھ کہنے سننے کا موقع دیئے بغیر نکل گیا۔ گھر سے تھوڑی دور آ کر فون کر کے شہباز سے تھوڑی معلومات

لی۔ فیصل کو پکا کر دیا۔ گھر سے کوئی فون آئے بتا دینا میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جواب میں فیصل نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے لائن کاٹ دی۔ اُسکے بعد موٹر سائیکل فل سپیڈ سے فیصل کی طرف جانے کی بجائے نارووال کو جا رہا تھا۔ بارہ بجے وہ ملک عالم حیات کی حویلی کے دروازے پر موجود تھا۔ جسکے دروازے چوہٹ گھلے ہوئے تھے۔ وہ موٹر سائیکل اندر لے آیا۔ ملازم اُسکو دیکھتے ہی اُسکی جانب آیا تھا۔ اُس نے موٹر سائیکل اسٹینڈ کی اور نیچے اتر آیا۔ چابی جیب میں ڈال کر بالوں میں ہاتھ مارا جو ہوا کے ساتھ اوپر کو اٹھ کر نیا ہی میسر سائل بنا چکے تھے۔ جب تک ملازم اُس کے قریب آیا۔ وہ آنکھوں پر رکھے ڈارک شیڈز بھی اتار چکا تھا۔

”جی کس سے ملنا ہے۔“

”پہلے تو یار ذرا ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلاؤ۔ پھر بات کرتا ہوں۔“

ملازم اثبات میں سر ہلا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ گاؤں کو آنے والی سڑک کچی ہونے کی وجہ سے وہ دھول مٹی کا ذائقہ منہ میں بھی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ آیا بھی وہ ہوا کے گھوڑے پر تھا۔ کالے کپڑوں اور کالی پشاوری چپل پر بھی سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔ اُس نے لباس ہاتھ سے جھاڑا اور پیروں کو ایک ایک کر کے زور سے زمین پر مارا۔ ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے نظر فل پر پڑی تو ادھر کو ہی آ گیا۔

حویلی بہت بڑے رقبے پر بنی ہوئی تھی۔ بہت پیچھے جانور نظر آرہے تھے۔ ایک طرف ٹریکٹر ٹرائل اور دوسری مشینری کھڑی تھی۔ فل کھول کر ہاتھ منہ دھوئے۔ کلی کی ہاتھ کے ساتھ تری لگا کر بالوں میں پھیرا۔۔۔

تب جا کر آنکھیں کھلیں۔۔۔

ملازم ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھائے منظر پر آیا۔ جس کو اُس نے گیٹ سے تھوڑا ہٹ کر بنے باغیچے میں گہری چھاؤں کے نیچے رکھے گری سیٹ کے میز پر رکھا۔ میسج بھی ادھر کو آ گیا۔ گری پر بیٹھ کر اُس نے ملازم کا بڑھایا ہوا پانی کا گلاس تمام لیا۔ دو چار گھونٹ میں اُس نے پانی ختم کر کے خالی گلاس میز پر رکھا اور منتظر کھڑے ملازم سے بولا۔

”میرا نام میسج طلال ہے۔ میں لاہور سے آیا ہوں۔ مجھے عالم حیات صاحب سے ملنا ہے۔ تم جا کر انہیں بتاؤ۔“

اس سے پہلے کہ ملازم وہاں سے جاتا۔۔ گیٹ سے گاڑی اندر آئی۔ ملازم بولا۔

”یہ اپنے شارق صاحب آئے ہیں۔ میں انکو بتاتا ہوں۔ آپ کو گھر تک لے جائینگے کیونکہ بڑے ملک صاحب اس وقت گھر پر ہی ہیں۔“

گاڑی سے تین چار لڑکے نکلے تھے۔ سارے کے سارے اچھے خاصے بچوں والے قد تو میسم جیسے ہی تھے۔ مگر جسم بھاری تھے۔

میسم وہیں بیٹھا رہا۔ پانی کے ساتھ ایک جگہ میں ملازم دودھ لایا تھا۔ تھوڑا سا گلاس میں ڈال کر پیا تو میسم کو دودھ کے ذائقے سے بڑا حرا آیا۔ چینی کے بغیر ہونے کے باوجود دودھ میٹھا تھا۔ وہ چوکنا ہوتا تو دیکھ پاتا۔ ملازم نے جب شارق کو اُسکے بارے میں بتایا تھا۔ تو شارق کی آنکھوں میں پہلے حیرت اُبھری پھر خون اُترا۔

اُسکو کیا پتا تھا۔ یہاں ایسا استقبال ہونے والا تھا۔ اس صورت میں وہ بھی کسی تیاری کے ساتھ آتا۔ تیاری نہیں تو کم از کم چوکنا ہی رہتا۔ وہ تو لڑکی کے باپ سے مل کر ایک دفعہ سچ بتانے کی نیت سے آیا تھا۔ مگر یہاں وہ ہوا۔ جسکا خواب و خیال میں بھی نہ سوچا تھا۔

شارق کروفر سے چلتا ہوا۔ میسم کی جانب آیا۔

جو ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر ریلیکس موڈ میں بیٹھا۔ سامنے کھیت میں مٹر چلتی عورتوں کو دیکھنے لگا۔
”تو تم ہو میسم طلال۔۔۔“

شارق کی آواز پر اُس نے چونک کر اُسکی جانب دیکھا۔ اور ٹھوڑی کے نیچے رکھا ہاتھ نکال کر جا چمکتی نظروں سے شارق کو دیکھتے ہوئے۔ اعتماد سے بولا۔

”جی میں ہی ہوں۔ کیا آپ عالم حیات صاحب کو بلا سکتے ہیں۔ میں صرف اُن سے ملنے کو آیا ہوں۔“

”ظاہر ہے، داماد اپنے سر سے ہی ملنے آئے گا۔ ہم کونسا کہہ رہے ہیں۔ ہم سے ملنے کو آئے ہو۔“

بیہودگی سے ہنستے ہوئے شارق نے منہ کھولا تو پان کھانے والے کے کالے دانت نظر آئے۔ میسم نے آنکھیں میچتے ہوئے۔ اُسکا سر تا پیر جائزہ لیا۔ بظاہر صاف ستھرے حلیے میں ملبوس اُس شخص کا اندر کالا تھا۔ میسم کو اُس سے پوچھنا پڑا۔

”تم کون ہو؟ عالم صاحب کے بیٹے ہو یا کوئی اور۔۔۔؟“

لہجے میں سے سامنے والے کے لیے عزت احترام جاچکی تھی۔ شارق اُسکو گھورتے ہوئے بولا۔
”میں وہ ہوں جسکی منگ کے ساتھ وقت تم گزارتے رہے ہو۔“

اُسکے الفاظ نے میسم کو آگ تو بڑی لگائی پر وہ برداشت کر گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”خیر جو کوئی بھی ہو۔ ایک بات تم نے بتادی ہے۔ ایک ہوتے ہیں۔ بے غیرت لوگ۔۔۔ جو اپنے گھر کی عورتوں کی تو عزت کرتے ہیں۔ پر باہر کی عورتوں کو نمٹنے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پر تم تو بے غیرتوں کے بھی بے غیرت نکلے جو غیر عورت تو چھوڑ اپنے گھر کی عورت کی عزت نہیں کر سکتے۔“

شارق کا ہاتھ میسم کے منہ پر تھپڑ مارنے کو اٹھا تھا۔ جسکو میسم نے درمیان میں ہی روک کر اپنے دوسرے ہاتھ سے کھینچ کر ایک چماٹ شارق کے جڑے پر ماری۔ اُس کے دوست اور نوکر سب دیکھ رہے تھے۔ شارق کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئی۔ بولا تو غصے سے اُسکی آواز پھٹی جا رہی تھی۔

”تم نے میرے ہی گھر میں کھڑے ہو کر مجھ پر ہاتھ اٹھا کر اچھا نہیں کیا۔“

”تم اچھائی کے قابل ہی نہیں ہو۔ گھر آئے مہمان پر ہاتھ اٹھایا کیا وہ اچھا تھا؟“

شارق نے نظر بچا کر میسم کے پیچھے کھڑے لڑکوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے میسم کو پیچھے سے گردن میں بازو ڈال کر جکڑ لیا۔ وہ تین تھے اور دوسری طرف وہ اکیلا۔

”تم میرے وہ بن نلائے مہمان ہو۔ جسکی خدمت میں دل و جان سے کرونگا۔ اور ایسی خدمت جسے تم ساری عمر یاد رکھو گے۔“

لڑکوں کی گرفت میں اُنکو اچھا خاصہ مشکل وقت دیتے میسم کے چہرے پر شارق نے اپنے انگوٹھیوں والے ہاتھ سے لگا تار پانچ سات ٹکے ناک اور ماتھے کے قریب مارے تھے۔ اُس کے ناک سے نکلنے والی خون کی دھار نے شارق کا ہاتھ بھی لال کر دیا۔

تکلیف کی شدت نے کچھ دیر کے لیے اُسکو اندھا بہرا کر دیا تھا۔ ناک کی تکلیف تو ویسے بھی ایک دفعہ نانی یاد کروا دیتی ہے اور وہ کوئی پروفیشنل فاسٹر تو نہیں تھا۔ جو ایسی صورتحال سے اس سے بہتر طریقے سے نمٹتا۔ پھر بھی

جیسے ہی حواس میں واپس آیا۔ ڈبان پھر بھی باز نہ آئی۔

”سالے خدمت تو ایسے کر رہے ہو۔ جیسے میں واقعی تمہارا بہنوئی لگتا ہوں۔“

اسکے آگے وہ سارے ہی اُس پر ٹوٹ پڑے۔ لاتوں گھونسوں کی بارش کے دوران اُس نے اپنا سر دونوں بازوؤں کے درمیان زور سے بھینچ لیا۔ مگر پھر بھی سر پہ لگنے والی ایک چوٹ سے جلد ہی اُس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ اگلی دفعہ جب آنکھوں کے بھاری پوٹے اٹھا کر دیکھنا چاہا تو جسم کا اک ایک حصہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ ایک آنکھ بڑی مشکل سے کھل رہی تھی۔ منہ میں بڑا بڑا اذائقہ گھلا ہوا تھا۔ اُس گھڑی اُس نے خود سے اعتراف کیا۔ یوں اکیلے یہاں آ کر بہت بڑی غلطی کر چکا تھا۔ اب آگے دیکھنا تھا۔ قسمت میں کیا لکھا تھا۔ تبھی اُس کو ادراک ہوا۔ اُسکے وجود کو کرسی پر باندھا ہوا تھا۔ تکلیف کے باوجود اُسے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”سالوں نے ثابت کر دیا۔ شیر مر کر بھی شیر رہتا ہے۔“

اُسکی سرگوشی کے جواب میں نیم اندھیرے کمرے سے شارق کی کرخت آواز اُبھری تھی۔

”شیر کس کو بول رہے ہو؟“

”اُسی کو جو بندھا ہوا ہے۔ کبھی تم نے دیکھا ہے۔ کسی نے گیدڑوں کو باندھ کر رکھا ہو؟“

جواب میں ایک تھپڑ اُسکے چودہ طبق روشن کر گیا۔

”اب بتاؤ یہاں کسکو ملنے آئے تھے؟“

”پہلے میرے ہاتھ کھولو پھر تمہیں تمہارے انداز میں بتاتا ہوں۔“

جواب میں پھر تھپڑ پڑا۔۔۔۔

وہ تکلیف اور غصے سے گالی دیتے ہوئے۔ بولا

”ایک دفعہ میرے ہاتھ کھول۔۔۔“

”پھر پوچھتا ہوں کہ کس سے ملنے آئے تھے؟“

”میں تو آتے ہی بتا چکا ہوں۔ اب تم بتا دو۔ کیا سنتا چاہتے ہو۔“

”میں سچ سنتا چاہتا ہوں۔ اور جب تک جھوٹ بولتے رہو گے۔ میں ایسے ہی تمہیں تھپڑ پر تھپڑ مارتا رہوں گا۔“

”ہاں تمہیں مجھے مارنے کا پرمٹ ملا ہوا ہے۔ ایک دفعہ صرف ایک دفعہ میرے ہاتھ کھول کر اکیلے میرے ساتھ بات کرو۔“

”رہا ب سے ملنے آئے تھے ناں۔۔۔۔“

”اُسکا یہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔ تم بس اُسکے باپ کو میرے پاس لاؤ۔“

اس دفعہ ایک کہ بجائے لگا تار تین تھپڑ اس کا ضبط ٹھیک ٹھاک آزما گئے۔

”ہاں سالے تیری بہن رباب میری گرل فرینڈ ہے۔ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی ہوئی ہیں۔ بڑے دنوں سے ملنے نہیں آئی تو میں خود آ گیا ہوں۔ اب بلاؤ اُسکو اگر مرد ہو تو۔۔۔۔۔“

جواب میں شارق بڑی خباثت سے ہنسا تھا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑافون اُسکے سامنے نہچاتا ہوا۔ وہاں سے چلا گیا۔

میسیم آنکھیں میچ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔۔۔۔۔

اب اُسکو اپنے آپ پر بھی غصہ آرہا تھا۔ تب ہی اُسکے دماغ میں سے ایک خیال گُزرا۔۔۔

”اگر میرے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔ تو زباب کے ساتھ اب تک کیا گچھ ہو چکا ہوگا؟ کہیں انہوں نے اُسکو مار ہی نہ دیا ہو۔۔۔“

نہ جانے کیا کیا خیال اُسکے دماغ کو اور بھی منتشر کرتے رہے۔

مگر اس وقت وہ پوری طرح سے ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھا۔ اب آگے دیکھنا تھا۔ کیا ہونے والا ہے۔
اُسکو پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ مگر نیم اندھیرے میں سوائے اُسکی آتی جاتی سانسوں کی آواز کے اور کچھ
دیکھائی یا سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور اس حالت میں اُس نے یہاں نہ جانے اور کتنا وقت رہنا تھا۔ وہ اس بات
سے بھی لاعلم تھا۔ آیا باہر ابھی تک دن ہی ہے۔ یا رات ہو گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

اگر آج سے پہلے رگوں کی دیوانی کو کوئی آکر یہ کہتا۔ زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ جب زندگی نہ آگے بڑھتی ہے۔ نہ پیچھے کو سفر کرتی ہے۔ بلکہ بالکل ساکت ہو جاتی ہے۔ ساکت زندگی ساکت سوچ ساکت انسان۔۔۔ کوئی یہ کہتا یہ سب ممکن ہے تو وہ ایک تقریر کر دیتی۔ زندگی کبھی نہیں رکتی۔ جیتا جاگتا انسان ساکت کیسے ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ جاندار ہے اور جاندار کی تعریف ہی یہی ہے۔ وہ بڑھتا پھولتا ہے۔ اپنے ارد گرد کے ماحول، موسم، رویوں پر ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔ اسلیے کبھی بھی منجمد نہیں ہوتا۔ حرکت میں رہتا ہے۔ مگر اب وہ ہار گئی تھی۔ اُسکو دکھ یہ مار گیا۔ نہ باپ نے نہ ماں نے نہ ہی بھائی نے۔ کسی نے ایک دفعہ پوچھنا گوارہ نہ کیا۔ آخر ہوا کیا تھا؟

دوسروں کے رویے سے آپ نہیں مرتے ہیں۔ دوسروں کی حیثیت ہی کیا ہے؟ آپکو اُن کے رویے خوشی دیتے ہیں یا دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینکتے ہیں۔ جن سے آپ براہِ راست منسلک ہوں۔ جودل کے مکین ہوں۔ جو آپ کے سب سے زیادہ اپنے ہوں۔ جن سے آپکی ساری امیدیں ہوں۔ مگنی ٹوٹنے کا غم نہیں ہوا تھا۔ دل ٹوٹنے کے غم نے آدھوا کر دیا۔ ساری توانائی چوس لی۔ ایک ہی ہفتے میں اُسکا سارا رنگ و روپ کھو گیا تھا۔ چچی نے فسادِ ہونے کا پورا پورا حق ادا کرتے ہوئے۔ سارے خاندان اور گاؤں میں زباب کے نام کے ساتھ میسم طلال کا نام لگا کر اتنے قصے کہانیاں چھوڑیں تھیں کہ کوئی فیکشن لکھنے والا بھی یہ اسکرپٹ اتنا شاندار نہ لکھتا۔ رہی سہی کسر اُنکی اکلوتی موم بتی نانکھ نے پوری کر دی تھی۔ اُس نے زباب کی ایک ایک دوست کو فون کر کے مزے لیکر سارا قصہ بالکل ہی نئے معنی سے سنایا تھا۔

امی تو مستقل بستر سے جا لگی تھیں۔ عالمِ حیات اس سارا ہفتہ اپنے کمرے سے ہی نہ نکلے تھے۔ اندر نہ جانے سارا وقت وہ کیا کرتے۔ سوائے عبداللہ کے اُنکے کمرے میں اور کوئی بھی نہ جاتا۔ کسی کو اجازت نہیں تھی۔ عبداللہ ہی کھانے کے برتن لاتا۔ لے جاتا۔

امی نے رو رو کر حد ختم کی ہوئی تھی۔ مگر پھر نہ جانے اور آنسو کہاں سے آ جاتے۔ اوپر سے غضب یہ کہ رشتے دار اور گاؤں کی عورتیں اُنکے پاس افسوس کرنے ایسے آتی تھیں۔ جیسے خُدا انخواستہ اُنکی بیٹی مر گئی ہو۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔۔۔ ایک وہ تھی۔ اپنے بیڈ پر اکڑ کر بیٹی رہتی۔ سارا سارا دن ساری ساری رات۔۔ ایک پل کو آنکھ نہ لگتی۔ نہ بھوک رہی نہ پیاس۔۔۔ ہر اذان کے وقت اُنٹھتی کمرے میں موجود انبج ہاتھ

سے وضو کرتی اور نماز پڑھ کر پھر ویسے ہی بیٹھ جاتی۔

سارے خواب ساری خواہشیں راکھ ہو چکی تھیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی۔ جو آگے آرہا ہے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ ہلا دینے والا ہے۔

دروازے پر ہلکی سی دستک دیکر دروازہ وا کرنے والا عبداللہ تھا۔
اُس نے گھٹنے سے سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

وہ بھی مخاطب کئے بغیر بولا۔

”ابو تمہیں اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔“

اب کے وہ چوکی۔ سر اٹھا کر بھائی کو دیکھا جو اپنی بات کرتے ہی واپس مڑ گیا تھا۔

جسم میں انجانی سی طاقت دوڑ گئی۔ بلا خر خاموشی کا قفل ٹوٹا تھا۔ آخر ابو کو اُس کا خیال آ ہی گیا تھا۔ جلدی سے پیروں میں جوتے ڈال کر باہر آئی۔

ابو کے کمرے میں قدم رکھتے ہی قدم سست پڑ گئے۔ وہاں صرف ابو اکیلے نہیں تھے۔ ضیاء چاچو ابو کے ساتھ بیڈ پر بیٹھے تھے۔ امی ایک طرف گرسی پر بیٹھ کر اس وقت بھی آنچل سے آنسو صاف کر رہی تھیں۔ عبداللہ ناراض سا ابو کے پیچھے کی جانب کھڑا تھا۔

ان سب کے علاوہ گرسی پر ایک مولوی صاحب رجسٹر لیے بیٹھے تھے۔

اُسکو دیکھتے ہی ضیاء چاچو آگے آئے اور اُسکو بازو سے پکڑ کر اپنے اور ابو کے درمیان والی جگہ پر بیٹھا دیا۔

ابھی وہ بیٹھی ہی تھی۔ جب کمرے میں ابو کی آواز گونجی۔ ”مولوی صاحب نکاح شروع کریں۔“

اُسکے دل کی دنیا اتھل پتھل ہو گئی۔ وہ تو کچھ اور سوچ کر آئی تھی۔ یہاں کیا ہو رہا تھا۔

کیا چچا نے اپنی بیوی کو منا لیا ہے۔ کس دل سے چچی اس شادی پر راضی ہوئی ہوگی۔ اسی لیے اس وقت

یہاں موجود نہیں ہے۔ یہ بھی تو احتجاج کی ہی ایک شکل ہے۔ چلو اچھا ہے۔ شادی کر کے ایک ہی دفعہ میرے ماں

باپ مجھے آگ میں پھینک دیں۔ جس نے پہلے ہی مجھے ہر طرف بدنام کر دیا ہے۔ شادی کے بعد مجھے کیوں کوئی

سکھ کا سانس لینے دے گا۔ سوچ کے گھوڑے پر سوار وہ وہاں بیٹھے بیٹھے نہ جانے کہاں سے کہاں چلی گئی۔ حقیقت

کی زمین پر تب پٹھی گئی۔ جب مولوی کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پر غور کیا۔

”رباب ولد عالم حیات کیا آپکو میسم ولد طلال احمد کے ساتھ اپنا نکاح حق مہر دس لاکھ سکھ رائج الوقت کے مطابق قبول ہے؟“

اُسکو لگا وہ غلط سن رہی ہے۔ مگر ایک دو اور پھر تیسری دفعہ مولوی نے وہی الفاظ ذہرائے۔ وہ ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھ کر چیخی۔

”مجھے ایک ہی دفعہ گولی کیوں نہیں مار دیتے۔ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیں۔ مگر یہ موت سے بدتر زندگی تو مجھے نہ دیں۔“ چاچو نے پیار سے اُسکو تھام کر اپنے ساتھ لگایا۔

”ایسے نہیں کہتے میری بیٹی تو بڑی بہادر ہے۔ ابھی بس اس نکاح کے لیے ہاں کر دو۔ باقی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ابو اسی طرح نظریں فرش پر جما کر سپاٹ چہرہ لیے بیٹھے تھے۔ امی بھی سر جھکا کر آنسو صاف کر رہی تھیں۔

”چاچو میں مرنے تو جاؤنگی مگر یہ نکاح نہیں کرونگی۔“

اس دفعہ چاچو نہیں ابو بولے اور ایسا بولے کہ اُسکو ہمیشہ کے لیے چپ کر وا گئے۔

”چلو ٹھیک ہے۔ نکاح نہ قبول کرو۔ مگر میں تمہیں مارنے کی بجائے خود کو ختم کر دوں گا۔ پھر تم اپنی زندگی اپنے رنگ سے جی لینا۔ اور اگر تمہارے دل میں میری ذرا سی بھی عزت ہے۔ تو یہ نکاح قبول کر لو۔“

آزمائش کی گھڑی سے گورا آئے تو ضیاء

جشنِ غم جاری ہوا آنکھ سے آنسو آئے

اُس نے ایک نظر اٹھا کر بھی مزید کسی کی جانب نہ دیکھا۔ مولوی نے اپنا جملہ دہرایا وہ ساتھ دیتی گئی۔ ہاں کرنے کے بعد کانپتے ہاتھوں سے مطلوبہ جگہ پر دستخط کر کے وہاں سے اٹھ گئی۔ چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

شارق نے اپنی طرف سے تو بڑی خطرناک گیم کھیلی تھی۔ اُس نے اپنی اور میسم کی ساری گفتگو فون میں ریکارڈ کی تھی۔ پر صرف وہ حصہ رکھا جس میں میسم یہ کہہ رہا تھا کہ وہ زباب سے ملنے آیا ہے۔ آگے پیچھے ایڈیٹ کر کے اُس نے یہ آڈیو باپ اور تایا کے سامنے چلانے کے بعد اعتراف کیا کہ میسم کی اس بات کا مزا چکھانے

کے لیے میں نے دوستوں کے ساتھ مل کر اسکی طبیعت صاف کی ہے۔

بعد میں ضیاء ڈیرے پر گئے۔ گودام والے کمرے میں ٹرے کے ساتھ رسیوں سے بندھے لڑکے کو دیکھ کر انکو شارق پر بے حساب غصہ آیا تھا۔

انہوں نے ملازم سے کہہ کر فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور خود آگے بڑھ کر میسم کو کھول کر اپنے ساتھ لے آئے۔ جو خون نکلنے کی وجہ سے کبھی نیند میں جاتا کبھی ہوش میں آتا۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے یہ لگن مٹی کھیل رہا تھا۔ شارق باپ کو غصے میں دیکھ کر منظر سے ہٹ گیا تھا۔ کیونکہ ضیاء کوئی لحاظ نہ کرتے تھے۔ غصے میں ہوتے تو نوکروں کے سامنے ہی اسکی عزت افزائی کر دیتے۔ ابھی تو پھر اس نے ایک بندے کو بلا وجہ تشدد کا نشانہ بنا کر کام کافی حد تک خراب کر دیا تھا۔

مگر ایک چیز کی اسکو خوشی تھی۔ جو تھپڑ اسکے باپ نے ماں کو سب کے درمیان میں مارا تھا۔ اسکا بدلا وہ لے چکا تھا۔ کچھ اسکو میسم پر ویسے ہی غصہ تھا۔ کچھ بھی تھا۔ وہ زباب کو پسند کرتا تھا اور اچانک سے زباب کے ساتھ ہر جگہ میسم کا نام لئے جانے کی وجہ سے وہ اندر سے ہرٹ ہوا تھا۔ ساتھ ہی غصہ بھی تھا۔ کیوں اس دن وہ اس لڑکے کی مدد لیکر اسکے ساتھ گئی۔ وہ لوگ گوجرانوالہ سے لاہور آتے ہوئے ٹریفک میں پھنس گئے تھے۔ جو کالا شاہ کا کو سے شروع ہو کر شہرہ تک ساری سڑکیں پوری طرح جیم تھیں۔ یہاں تک کہ وہ شیخوپورہ کے رستے لاہور کو آئے آگے پھر وہی مصیبت ملی۔ وہ لوگ شام پانچ بجے سے گاڑی میں پھنسے تھے۔ اور رات کو پونے بارہ بجے وہاں سے خلاصی ہوئی اور ساڑھے بارہ بجے وہ لوگ گیلری کے باہر تھے۔ پر وہ وہاں نہیں تھی۔ نانکھ کو فون کر کے پوچھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

گھر پہ فون کیا تو علم ہوا وہاں بھی نہیں ہے۔ نانکھ نے تسلی دی ہو سکتا ہے۔ اپنی کسی دوست کے گھر چلی گئی ہو۔ اب ساری رات گیلری پر تو نہیں رک سکتی تھی۔

عبداللہ اور شارق گھر چلے گئے۔۔۔

ضیاء اسکو گودام سے نکال کر ایک کمرے میں لے آئے تھے۔ جہاں ایک طرف کمرے کی سیٹنگ ڈرائیونگ روم جیسی تھی۔ دوسری طرف ایک چارپائی پچھی ہوئی تھی۔

”آپ کون ہیں؟“

اُس نے اُنکے چہرے پر فکر مندی دیکھ کر پوچھا۔

”میں رُباب کا چچا ہوں۔“

”حیرت ہے۔ آپ کے بیٹے نے آپ سے تو کچھ نہیں سیکھا۔“

”نو جوان نسل جذباتی ہوتی ہے۔ عقل گھٹنوں میں لیکر گھومتے ہیں۔“

”اب آپ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں؟“

”فی الحال تو ڈاکٹر کا انتظار کر رہا ہوں۔ تاکہ تمہاری مرہم پٹی کروا سکوں۔“

”بیٹے کے اعمال اچھا نا چاہ رہے ہیں۔“

”نہیں یار! اسکو تو میں نہیں چھوڑوں گا۔“

دروازے سے باہر آوازوں نے بتا دیا ڈاکٹر آ گیا ہے۔

اُس نے سارے زخم صاف کئے۔ گھر سے صاف لباس منگوا کر انہوں نے اُسکے خون اور گرد سے اٹے کپڑے بدلوائے۔ گرم دودھ میں ہلدی ملا کر اسکو دی ساتھ میں ڈاکٹر کی دی گئی درد کی گولیاں۔

”کیا وقت ہوا ہے۔ مجھے گھر جانا ہے۔“

”آج کی رات تم ادھر ہی رکو گے۔“

”جی نہیں میں کسی کے باپ کا غلام نہیں ہوں۔ مجھے ابھی جانا ہے۔ آپ عالم حیات صاحب سے میری

ملاقات کروادیں۔ اُسکے بعد میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

انہوں نے ملازم کو بھیجا۔۔۔۔۔

پندرہ منٹ بعد ملک عالم حیات وہاں آئے۔ پہلی نظر اُس پر پڑتے ہی چونکے۔ اُسکا سارا منہ سو جا ہوا تھا۔

”میں عالم ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے۔ تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔“

”افسوس کہ اس وقت میں اُٹھ کر آپ سے ہاتھ بھی نہیں ملا سکتا۔ پر یہ بات میں نے نہ جانے کتنے گھنٹے پہلے

کی تھی۔ بلا خراپ تشریف لے ہی آئے۔“

”تو اُس دن وہ تمہارے ساتھ تھی؟“

”یہی بتانے کو آیا تھا۔ مگر اُس سے پہلے میرا آپ سے ایک سوال ہے۔ اگر آپ رات کے وقت کہیں سے گزور رہے ہوں۔ وہاں ایک خاتون اکیلی کھڑی نظر آئے کہ جہاں دن میں بھی ماس نوچنے والے گدھ منہ کھولے اپنے شکار کی تلاش میں گھومتے ہوں۔ وہاں رات کے وقت کوئی عورت کھڑی ملے اور بائے چانس آپ اُس کے نام سے بھی واقف ہوں۔ آپ کے محلے کی لڑکی ہے۔ کالج و سکول میں ساتھ پڑھتی ہے۔ کیا آپ کان لپیٹ کر وہاں سے گزر جائیں گے۔ یا پھر زک کر ماجرہ جاننے کی کوشش کریں گے؟“

عالم حیات نے کچھ نہیں کہا۔ سر نہجکا کر فرش میں نہ جانے کیا کھوجتے رہے۔ اُس نے جواب کی اُمید بھی نہیں پالی تھی۔

”میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کی بیٹی اور میرے درمیان کوئی تعلق ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ کبھی بات چیت بھی نہیں رہی۔ میں نے شناسا چہرہ ہونے کہ بنا پر اُس دن اُسکے پاس جا کر مدد کی آفر کر کے صرف اپنا اخلاقی فرض نبھایا تھا۔ قصور وار وہ نہیں ہے۔ جس کو آپ لوگ یوں بدنام کر کے سزا دے رہے ہیں۔ بلکہ وہ ہیں۔ جو اُس دن وقت پر اُسکو لینے نہیں پہنچے۔ میں اُسکے کہنے ہر اُسکو کزن کے ہاسٹل ڈراپ کرنے گیا تھا۔ راستے میں پولیس والے مل گئے۔ میری جیب سے دوست کو تنگ کرنے کے لیے جو ڈرگ چوری کیے تھے۔ وہ ہمیں مزید مشکوک کر گئے۔ اتنی سی ساری بات ہے۔“

”بچوں کی بات جب آئے ناں صاحبزادے تو اتنی سی باتیں زہر سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ کیا تم اس بات کہ گواہی دینے آئے ہو کہ میری بیٹی بے قصور ہے اور اُسکا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے؟“

”جی بالکل۔۔۔ بالکل ایسا ہی ہے۔“

”کیا تم رُباب سے شادی کرو گے؟“

”اگر تم ہاں کرتے ہو۔ تو میں اسی وقت اُسکا نکاح کر کے تمہارے ساتھ بھیج دوں گا۔ کوئی بھی جلد باز بیان دینے سے پہلے یہ جان لینا۔ وہ میرا خون ہے۔ میں اُسے تم سے بہت اچھے طریقے سے جانتا ہوں۔ مگر میں جا کر

لوگوں کے گریبان نہیں پکڑ سکتا کہ خبردار کوئی میری بیٹی کے لیے غلط بات نہ بولے۔ تم اگر غلط اور درست بات کی صفائی دینے کے لیے یہاں تک آگئے ہو۔ اب بتاؤ اسی بے قصور کو اپنا نام دینے کو تیار ہو؟“

تین افراد کمرے میں موجود تھے۔ چوتھا عبداللہ دروازے کے اندر کھڑا تھا۔ مگر اسکے باوجود طویل خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ بولا۔۔۔

”اگر میں نہ کر دوں تو؟“

”تو میں زبردستی ہاں کروالونگا۔ ہر طرف اُسکا نام تمہارے ساتھ نکلا ہوا ہے۔ اب شادی بھی تمہارے ساتھ ہی ہوگی۔ یہ تم پر ہے۔ سیدھے سے ہاں کرتے ہو۔ یا ناگوں میں گولیاں کھا کر۔۔۔“

”یونواٹ تم ساری کی ساری فیملی ہی جنگلی پاگل لوگ ہو۔ میری تو مت ماری گئی تھی۔ جو یہاں آگیا۔ میری طرف سے آپ اپنی بیٹی کو رکھیں یا بھاڑ میں بھیجیں۔۔۔ میں تو چلا۔۔۔“

وہ ابھی اٹھ کر کھڑا ہی ہوا تھا۔ جب عبداللہ نے اُسکی ناگ کے قریب فرش پر نشانہ لگا کر فائر کو دیا۔ وہ ہڑبڑا کر پیچھے کو گرا تھا۔ اپنی ناگوں کے صحیح سلامت ہونے کی تسلی کر لینے کے بعد اپنے ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اب وہ واقعی تھک گیا تھا۔ سامنے دیوار پر لگی گھڑی شام کے پانچ بج رہی تھی اور سارا دن اُس نے کچھ کھایا یا پیتا نہیں تھا۔

عالم حیات نے دوبارہ سے نہیں پوچھا۔ بلکہ دروازے میں کھڑے عبداللہ کو حکم دیا۔

”جا کر مولوی کو بلاؤ۔ نکاح پڑھائے۔۔۔“

اگلے آدھے گھنٹے میں نکاح ہو گیا۔ پہلے میسم سے ہاں کروائی گئی۔ اُس کے بعد اندر جا کر زباب کو گھیرا گیا تھا۔ وہ اگلا سارا وقت غصے میں بھرا بیٹھا رہا۔

نکاح ہونے کے بعد اندر سے ایک خاتون آئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہیں۔ مگر اُنکی آنکھوں کے اندر کا نرم تاثر یہ اشارہ کرتا تھا۔ وہ یقیناً زباب کی ماں ہے۔

وہ اُسکے لیے کھانا لیکر آئی تھیں۔

جسکو اُس نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ اُنکے بڑے اصرار پر صرف چند تھمے زہر مار کئے۔

”میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ آپ پلیز زباب کو بھیج دیں۔“

وہ اتنا کہہ کر اُس کمرے سے نکل آیا۔ جہاں لاسٹ پہلے ہی ڈم تھی باہر آیا تو شام ہونے کو تیار تھی۔

موٹر سائیکل کے قریب جا کر معلوم ہوا۔ نہ صرف اُسکا چین توڑ دیا ہوا تھا۔ بلکہ پیٹرول بھی ضائع کیا گیا تھا۔

زیر لب اُس نے موٹی موٹی تین چار گالیاں نکالیں اور اُسی طرح موٹر سائیکل ساتھ لیکر چلتا باہر کو بڑھ گیا۔

ضیاء حیات نے بہت کہا اُنکا ڈرائیور گاڑی پر دونوں کو چھوڑ آئے گا۔ موٹر سائیکل ادھر ہی چھوڑ جاؤ ٹھیک کروا کر بھیج دیں گے۔ مگر اُس نے ایک نہ سنی۔

”آپ لوگ جتنا کر چکے ہیں۔ وہی بہت ہے۔ مزید کی گنجائش نہیں ہے۔ اس وقت تو بس مہربانی کر کے

اُس خاتون کو باہر لے آئیں۔۔۔“

زباب اپنے کمرے میں تھی۔ جب امی اتنے دنوں میں پہلی دفعہ اُسکے کمرے میں آئیں تھیں۔

”رباب بیٹا میسم جا رہا ہے۔ اور اُس کا کہنا ہے۔ تم اُسکے ساتھ چلو۔ میں بیگ میں تمہارے چند جوڑے

زیور ڈال دیتی ہوں۔ ساتھ لے جاؤ باقی میں بھیج دوں گی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”کیا وہ باہر انتظار کر رہا ہے؟“

”ہاں۔۔۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ الماری کے دراز سے اپنا پاؤچ پکڑا۔۔۔ جس میں اُسکی اپنی محنت کی کمائی تھی۔

بیروں میں سٹریپ والے جوتے پہنے اور باہر نکل آئی۔

ماں پیچھے آوازیں دیتی رہ گئیں۔ وہ نہیں رُکی۔ کسی سے نہیں ملی۔ کسی کے گلے لگ کر نہیں روئی۔

باہر گیٹ سے کچھ ہٹ کر وہ کھڑا تھا۔ وہ پہلی نظر میں اُسکو پہچان ہی نہ پائی۔ چہرہ سوچ کر پتا نہیں کیا بنا ہوا

تھا۔ یہ تو چاچو اُسکے پاس کھڑے تھے۔ جس سے اُسکو اندازہ ہوا یہ وہی ہے۔

رباب کو گیٹ سے باہر دیکھ کر اُس نے ضیاء صاحب سے مصافحہ کیا۔ اور چل پڑا۔۔۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر

چادر میں چہرہ چھپائے اُسکے پیچھے پیچھے تھی۔

اتنے زیادہ جسمانی تشدد کے باوجود یہ شکر تھا۔ اُسکی ٹانگوں پر کوئی سیریس چوٹ نہیں آئی تھی۔ ورنہ یوں چل

کر جانا ایک ناممکن سی بات ہوتی۔

دونوں آگے پیچھے چلتے گئے۔ اور گاؤں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے۔ گاؤں سے اگلے شاپ کے قریب تھے۔ جب وہ پہلی دفعہ بولی تھی۔ اُسکو اُس شاپ پر موجود ورکشاپ کا ہٹا کر خود وہیں بیٹھ گئی۔ وہاں موٹر سائیکل کو بننے کے لیے دیکر اُس نے فیصل کو فون کیا۔ اگلے دو گھنٹے وہ لوگ وہیں رُکے رہے۔ کھانے کو تو کچھ بھی میسر نہیں تھا۔

وہ شاپ سے ہٹ کر ڈوبتے سورج کی روشنی میں بیٹھی آتی جاتی ٹریفک کو دیکھتی کبھی رونے لگ جاتی۔ کبھی چُپ کر جاتی۔

اُس نے نہیں پوچھا۔ کس بات پر رو رہی ہو۔ اپنے یوں رخصت کئے جانے پر یا میرے ساتھ رخصت کئے جانے پر۔ بلکہ آکر خاموشی سے اُسکے برابر بیٹھ گیا۔ فیصل آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ ساتھ شہباز اور طلال احمد خود موجود تھے۔

باپ کو سامنے دیکھ کر میسم نے نظر خجرائی چاہی۔ انہوں نے کھینچ کر ایک تھپڑا سکے پہلے سے نیلے پڑے گالوں پر جھڑ دیا۔

”تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ جدھر دل کرتا ہے۔ منہ اٹھا کر تنہا چل پڑتے ہو۔ اگر آج وہ لوگ تمہیں جان سے مار دیتے تو میں اپنا بیٹا کہاں سے لاتا۔ جبکہ مجھے یہی علم نہیں تم ہو کہاں۔“ جواب میں وہ زبردستی اُنکے گلے لگ گیا۔

”مجھے معاف کر دیں۔ آج میں نے واقعی بہت بڑی غلطی کی ہے۔ مگر اب کیا کروں۔ ایک اور تھپڑ مارنا ہے۔ تو ابھی ہی مار لیں۔ یہ زباب ہے۔ آپکی بہو۔۔۔۔۔“

طلال احمد نے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ پھر اُسکے پیچھے کھڑی کانپتی ڈری سی اُس لڑکی کو۔ جو ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہو رہی تھی۔ فیصل اور شہباز راستے میں اُنکو ساری صورتحال سے آگاہ کر چکے تھے۔

اُن کو زباب کی شکل میں وہاں پر ملیجہ کھڑی نظر آئی۔ دل کو کچھ ہوا۔ آگے بڑھے اور زباب کو سر پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ اپنے ساتھ لگا کر گاڑی تک لائے۔ جسکے آنسو سسکیوں میں بدل گئے۔ جو تسلی بھرا ہاتھ اپنے باپ کی

جانب سے مانگ رہی تھی۔ وہ ہاتھ اس رحم دل انسان کی جانب سے ملا۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

رُباب کو طلال احمد نے فرنٹ بینجر سیٹ پر بیٹھایا۔ خود وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ تینوں کچھلی سیٹ پر گھس گئے۔ سارا راستہ فیصل اور شہباز کے چہروں سے شرارتی مسکراہٹ نہ گئی۔ وہ دونوں کی کمینگی کو نظر انداز کرنے کی خاطر آنکھیں موند کر اپنا سر فیصل کے کندھے پر رکھ کر پڑا رہا۔

وہ اُسکو دو دو ہاتھ لینا چاہتے تھے۔ مگر رُباب اور طلال احمد کی وجہ سے خاموش بیٹھے رہے۔ لاہور آنے پر پہلے فیصل اور شہباز کو اُنکے گھروں پر ڈراپ کیا۔ پھر اپنے گھر آئے۔ ساڑھے دس بج گئے تھے۔ خدیجہ اور ملیحہ ہر بات سے لاعلم دونوں کے انتظار میں سیٹنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

وہ اس چیز سے بھی بے خبر تھیں۔ کہ دونوں باپ بیٹا ایک ساتھ ہی ہیں۔
باہر گیٹ کی آواز کے بعد گاڑی کے انجن کو سن کر خدیجہ کوتلی ہوئی۔ چلو طلال تو پہنچ گئے تھے۔ اب وہ خود ہی فون کر کے میسم کی خبر لے لیتے۔

مگر سب سے پہلے اندر داخل ہوتے میسم کی حالت دیکھ کر اُن کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ٹوٹے ہوئے سپرنگ کی طرح اُچھل کر صوفے سے اتریں۔۔۔

”تمہاری ماں مر جائے تمہیں کیا ہوا ہے۔ اسی لیے آج صبح سے میرا دل ڈوب رہا تھا۔ تم کہاں تھے؟۔۔“
میسم کے زخمی چہرے کو دونوں ہاتھوں میں نرمی سے تھام کر جائزہ لیتے ہوئے اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔
میسم نے اُن کو بانہوں میں بھرا۔

”ماں ریلیکس۔۔۔!! میں ٹھیک ہوں۔“

”مگر ہوا کیا ہے؟“

اب کے وہ طلال احمد کی جانب مڑیں۔

”آپ اسکو کہاں سے لیکر آ رہے ہیں۔ آج تو اس نے کالا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ یہ ان کپڑوں میں کیسے؟“
اُن کی بات منہ میں رہ گئی۔ طلال احمد کے پیچھے سہی 'ڈری' ہوئی وہ کمزوری لڑکی کھڑی اپنی موٹی موٹی

خوفزدہ نظروں سے اُن کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ لڑکی کون ہے۔۔۔؟“

طلال احمد نے آگے بڑھ کر اُنکا بازو اپنی نرم گرفت میں لیا اور خاموش تماشاائی بنی ملیجہ کی جانب مُڑے۔

”مٹی بہن کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ فریش ہونے میں مدد دو۔ پھر کھانا لگواؤ۔۔۔ اور میسم جاؤ تم بھی ذرا

منہ ہاتھ دھواؤ۔۔۔ کھانا اکٹھے کھاتے ہیں۔ تب تک میں تمہاری ماں سے ایک دو ضروری باتیں کر لوں۔“

ابو امی کو ساتھ آنے کا بول کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

ملیجہ حیران پریشان کھڑی میسم کو دیکھتی کبھی زباب کو۔۔۔

میسم نے حسبِ عادت اُسکے سر پر چپت لگائی۔

”حالت دیکھو اپنی۔۔۔ ڈرو نے لگ رہے ہو۔ پھر بھی آرام نہیں۔ یہ کون ہیں؟“

میسم نے اپنی ایک پوری اور ایک آدھی گھلی آنکھ سے زباب کو دیکھا جو ابھی تک وہیں بیٹھیوں کے پاس کھڑی تھی۔

آگے بڑھا اُسکا ٹھنڈا پڑا ہاتھ پکڑا۔۔۔ وہ اُس کے کندھوں تک آرہی تھی۔

”اتنا کیوں ڈر رہی ہو۔ اپنے گھر آئی ہو۔ جسٹ ریلیکس۔۔۔“ ملیجہ نے خوفزدہ ہو کر اپنے دونوں ہاتھ منہ

پر رکھے۔

”بھائی کہیں یہاں بھی کوئی فلم والا سین تو نہیں ہو رہا۔ کہیں یہ ہماری وہ بہن تو نہیں جو ابو کی دوسری بیوی سے

ہوئی۔ جسکا انہوں نے آج تک ہم میں سے کسی کو نہیں بتایا ہوا تھا اور آج اُنکی دوسری بیوی کے مرنے پر یہ بچی

اکیلی ہو گئی ہے۔ تو وہ اسکو گھر لے آئے ہیں۔“

میسم نے تالی بجائی۔۔۔

”آئی مسٹ سے تمہارے اندر کہانی بچنے کا ہنر موجود ہے۔ مگر اس قدر ڈرامہ نہیں ہے۔ یہ میری بیوی ہے۔

زباب میسم۔۔۔“ اب کہ ملیجہ کی چیخ ہی نکل گئی۔

”کیا کہہ رہے ہو؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“

”بس ہوتے ہیں مجھ دن ایسے بھی جو انسان کی زندگی میں نئے باب لکھ جاتے ہیں۔ آج کا دن بھی تاریخی ہے۔ تمہارے بھائی کی شادی ہوئی ہے۔“

”امی کو بتاتی ہوں۔ کیا اول فول بک رہے ہو۔ کس نے تمہاری اس شکل سے شادی کرنی ہے۔ ایسے لگ رہا ہے۔ جیسے کسی نے ہچک بیک سمجھ کر مارا ہے۔“

میسم سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ امی ابو کے کمرے سے امی کے اونچا اونچا بولنے کم رونے کی زیادہ آواز آرہی تھی۔

اُس نے زباب کا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

”ملی کھانا لگواؤ ہم لوگ ابھی آئے۔“

زباب کسی ربوٹ کی طرح اُس کے ساتھ کھینچی آرہی تھی۔ ملیجہ کو لگا آج تو پاگل ہی کرنے والے انکشاف ہو رہے ہیں۔ سر ہلاتی ہوئی کچن کی جانب چلی گئی۔ اوپر آ کر تیسرا کمرہ اُسکا تھا۔ اُسی طرح زباب کا ٹھنڈا بچہ ہاتھ اپنے بڑے سے گرم ہاتھ میں تھامے اُسکو اندر لایا۔ لائٹ آن کی زباب کو بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا خود اپنی الماری کی جانب بڑھ گیا۔

ٹریک سوٹ کی ڈھیلی سی پینٹ کے ساتھ ایک فل سیلو چمپر نکالا کپڑے بیڈ پر پھینک کر کمرے میں پڑے صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے بولنے لگا۔

”زباب۔۔۔ یہ حادثہ ہم سب کے لیے اتنا ہی نیا، حیرت انگیز۔۔۔ اور ڈرانے والا ہے۔ جتنا خوفزدہ تم اس وقت محسوس کر رہی ہو۔ امی کی بھی یہی حالت ہونی ہے۔ ابو اُنکو سنبھال لیں گے۔ مگر پھر بھی ماں ہیں جذباتی ہو کر کوئی بات کر جائیں۔ تو پلیز تم دل پر مت لینا۔ نہ ہی اُنکی کسی بات کو سنجیدہ لینے کی ضرورت ہے۔ ذرا غصہ کریں گی۔ پھر ٹھیک ہو جائیں گی۔“

بات کرتے کرتے وہ چونکا۔۔۔ وہ کوئی رد عمل نہیں دیکھا رہی تھی۔ یہ سمجھنا بھی مشکل تھا آیا وہ سن بھی رہی ہے یا ویسے ہی سر نہجکا کر اپنے ہاتھ کی لکیروں کو کھوج رہی ہے۔ وہ گہرا سانس کھینچتا ہوا صوفے سے اٹھ کر اُسکے برابر بیٹھا۔ وہ اپنی جگہ سمٹی۔

”جب ہم آخری دفعہ ملے تھے۔ کیا تم نے یہی لباس پہنا ہوا تھا۔ یا مجھے غلطی لگ رہی ہے۔“

اُس نے سر اٹھا کر ڈبڈبائی نظروں سے اپنے بہت قریب بیٹھے اپنے بہت ہی غیر شخص کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

اتنے قریب سے آج تک اتنی خوبصورت آنکھیں دیکھی بھی کب تھیں۔ اس لیے پہلے وار پر ہی بولڈ ہونا اتنی عجیب بات بھی نہیں تھی۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر کو گیا۔

رُباب نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے ایک نظر کمرے پر ڈالی۔۔۔ گہرے اور ہلکے نیلے رنگوں سے ساری سجاوٹ کی گئی ہوئی تھی۔ دیواروں کا رنگ کریم تھا۔ بیڈ بہت ہی نیچا۔۔۔ بغیر ہیڈ بورڈ کے ایک فریم کے اوپر موٹا سامیٹریس رکھا تھا۔ جس پر بیلو اور سلور بیڈ شیٹ چمچی ہوئی تھی۔ نیلا ہی کمبل پائینی پر رکھا تھا۔ گہرا نیلا کارپٹ دروازے کے قریب ایک سائڈ پر رائیٹنگ میز تھی۔ جس کے آگے ایک کرسی رکھی تھی۔ دروازے کے عین سامنے صوفہ سیٹ تھا جس کے پیچھے دیوار میں بک شلف بنی ہوئی تھی۔ بیڈ کے آگے دوسری جانب الماری اس کے ساتھ ڈرائنگ ٹیبل سیٹ تھا۔

وہ خالی الذہنی حالت میں گم تھی۔ وہ واپس اندر آیا تو ہاتھ میں دو عدد زنا نہ سوٹ کے ہینگر تھے۔ سکن رنگ کا کھاڑی کا سوٹ تھا۔ جس پر سرخ لپ پلک لگی ہوئی تھی۔ دوسرا کالے رنگ تھا۔

”یہ ٹی سے لیکر آیا ہوں۔ پلیز تم اٹھ کر گرم پانی سے شاور لو۔ مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔“

رُباب نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ترکی۔۔۔

”میں نے نہ کرنی چاہی تھی۔ پر ابونے کہا وہ خود کو ختم کر لیں گے۔ مجھے معاف کر دیں۔ مگر میری جگہ اس گھر میں نہیں ہے۔“

وہ آگے بڑھا۔ ایک دفعہ پھر اُس کا بازو پکڑ کر اٹھایا واش روم کی طرف لے گیا۔ اُس کو دروازے سے باہر کھڑا چھوڑ کر خود اندر گیا۔ سرخ سوٹ والا ہینگر اندر لٹکایا۔ شاور آن کیا۔۔۔۔۔

الماری سے نیا صاف تولیہ نکال کر اُسکے حوالے کیا۔

”رُباب پلیز ہیلپ می۔۔۔۔۔ میری حالت دیکھ رہی ہو۔ ہمیں آرام کی ضرورت ہے۔ نیچے ملیجہ کھانا لگا

رہی ہے۔ امی پہلے ہی آپ سٹ ہیں۔ تمہیں اس طرح دیکھ کر مزید پریشان ہوگئی۔ سن رہی ہو۔ تھوڑی سی ہمت پکڑو۔۔۔ جلدی سے شاور لیکر نکلو۔۔۔ ہم سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چلو شاباش۔۔۔“

وہ سر اثبات میں ہلاتی اندر بند ہوگئی۔ وہ تب تک وہیں کھڑا رہا جب تک در سری طرف سے پانی گرنے کی آواز نہ آئی۔

ٹھکر کا کلمہ پڑھتا ہوا۔ اپنے کپڑے پکڑ کر دوسرے واش روم کا رخ کیا۔

گرم پانی کی ٹکڑ سے اُسکو بڑا سکون محسوس ہوا تھا۔ زخموں کی اکڑ میں کمی ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ یہ بھی بھول گیا۔ نیچے سب کھانے پر انتظار کر رہے ہیں۔ ہوش تب آیا جب ملیجہ نے دروازہ بجا کر ڈھائی دی۔

”امی کو فکر ہو رہی ہے۔ باہر نکل آؤ۔۔۔۔۔“

جب وہ نیچے آیا تو سب پہلے سے ہی میز پر موجود تھے۔ امی کی آنکھیں روئی ہوئی لگ رہی تھیں۔ مگر یہ دیکھ کر تسلی ہوئی وہ زباب کو پاس بیٹھا کرنزی سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ نہانے کے بعد صاف سُتھرے لباس میں نکھری ہوئی تھی۔

”مجھے تو بڑی بھوک لگی ہوئی ہے۔ آپ بھی سب شروع کریں۔“

اُس نے اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے سر سری سا کہا۔ پھر سالن ڈال کر کھانے لگا۔ سب ہی اپنی اپنی پلیٹ کی جانب متوجہ ہو گئے۔ سوائے زباب کے۔ مگر امی نے پہلے کھانا نکال کر اُسکے سامنے رکھا پھر خود اپنے لیے نکالا۔۔۔۔۔

کھانے کے دوران اتنی باتیں نہیں ہوئیں۔ سب نے خاموشی سے کھایا۔ پیٹ بھرتے ہی میسم کی تو آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ماں کے گلے میں پیچھے سے ہاتھیں ڈال کر اُنکے گال پر پیار کیا۔ ساتھ ہی کان میں سرگوشی کی۔۔۔۔۔

”مجھے معاف کر دیں۔۔۔ آئندہ یوں اکیلا منہ اٹھا کر اپنی سُسرال نہیں جاؤں گا اور میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ البتہ آپکی بہو ڈری ہوئی لگ رہی ہے۔ باقی باتیں کل سہی ابھی بہت نیند آرہی ہے۔“

ایک دفعہ پھر اُنکے ماتھے پر پیار کرنے کے بعد کچن کے اندر چلا گیا۔ کیبنٹ میں سے دوائیوں والا باکس نکال کر تین مختلف گولیاں منہ میں رکھ کر پانی کے ساتھ نگل گیا۔ اور دو مزید نکال کر باکس واپس رکھنے کے بعد باہر میز کے قریب آیا اور وہ گولیاں زباب کے سامنے میز پر ڈال دیں۔

”یہ لے لینا۔ نیندا چھی آجائے گی۔“

اُس کی بات پر خدیجہ بولیں۔ ”میسو اسکونیند کی گولی بھی دے دو بیٹا۔ دیکھو نا کیسے اسکی آنکھوں کے گرد کالے سیاہ ہلکے پڑے ہوئے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا آج کل یہ نیند لے رہی ہے۔“

”مجھے بھی یہی شک ہوا تھا۔ اور ایک گولی نیند کی ہی دی ہے۔ ملی کھانا لگانے کا شکر یہ شب بخیر۔۔۔ ابو جی شب بخیر۔۔“ لیجھ نے جواب دیا۔ جبکہ طلال احمد نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ خود بھی ہاتھ دھونے کو سنک کی جانب بڑھ گئے۔ وہ ابھی پہلی سیڑھی پر چڑھا تھا۔ جب ماں کی آواز پر زک گیا۔

”اکیلے ہی بھاگ رہے ہو۔ زباب کو تو ساتھ لے جاؤ۔۔۔“

وہ تھما، مُڑتے ہوئے بولا۔

”ابھی تو کھانا کھا رہی ہوگی۔“

”کھا چکی ہے۔ دوا بھی لے لی ہے۔“

پھر وہ شفقت سے زباب کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔۔۔

”جاؤ بیٹی آرام کرو۔ انشا اللہ صبح تک بہتر محسوس کروگی۔ اور میسم تمہارے ڈیسک کی دراز میں وہ کریم پڑی ہوئی ہے۔ جو ڈاکٹر نے تمہیں کہنی پر لگانے کو دی تھی۔ جب گرنے سے اندر کی جلد متاثر ہوئی تھی۔ سونے سے پہلے چہرے پر لگا لینا۔ خالموں نے ذرا خیال نہیں کیا۔ میرا ایک ہی ایک بیٹا ہے۔ اتنی بے دردی سے مارا ہے۔ کہیں کوئی سخت چوٹ لگ جاتی تو پھر۔۔۔۔۔“

طلال کے اشارے پر وہ زباب کو لیکر وہاں سے کھسک گیا۔ کمرے میں آتے ہی دراز سے کریم ڈھونڈ کر لگانے کی نیت سے ڈرینگ کے شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر احتیاط کے ساتھ ساری لگانے لگا۔ ساتھ ساتھ زباب کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ جو کمرے کے وسط میں کھڑی ہو کر بیڈ اور صوفے کو جانچ کر شاید کوئی فیصلہ کرنا چاہ

رہی تھی۔ میسم نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

”کیا تم اپنے گھر فون کر کے بات کرنا چاہتی ہو؟“ وہ چونکی۔۔۔۔

”کوئی گھر۔۔۔؟ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔۔۔۔“

”میرا مطلب ہے۔ اپنی امی سے تو بات کرنا چاہتی ہوگی؟“

وہ اُسی طرح بغیر کسی ہلکے کے بولی۔۔۔۔ ”میری کوئی ماں نہیں ہے۔ میرا کوئی بھی نہیں ہے۔“

وہ جان چکا تھا۔ وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ تھکی ہوئی تھی۔ رشتوں پر سے اعتبار کھو چکی ہے۔ موضوع بدلتا ہوا بولا۔۔۔

”میری تھوڑی سی مدد کرو گی؟“

اُس نے سر موڑ کر سوالیہ نظروں سے میسم کو دیکھا۔

”میری کمر پہ درد ہے۔ کیا تم ادھر یہ کریم لگا سکتی ہو؟“

زُباب نے اُسکو ایسی نظروں سے دیکھا۔ جیسے میسم نے کہہ دیا ہو۔ مینار پاکستان سے چھلانگ لگا سکتی ہو۔ وہ اُسکے تاثرات دیکھ کر زیر لب مُسکرایا۔ یہی وہ چاہتا تھا۔ اُسکا دھیان بچے اور وہ ربوٹ کی بجائے انسان جیسا ردِ عمل ظاہر کرے۔

”اگر تمہارے لیے مشکل ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں ملی یا امی کو بلاتا ہوں۔ وہ لگا دیں گی۔“

”نہ۔۔۔ نہیں اُنکو پھر سے کیا تکلیف دینی میں ہی لگا دیتی ہوں۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی زُباب کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔ میسم چلتا ہوا اُسکے قریب آیا اور کریم اُسکی جانب بڑھادی۔

”یہاں کھڑے کھڑے لگا دو گی۔ کہ یا میں لیٹ جاؤں۔۔۔؟“

”نہیں ایسے ہی لگا دیتی ہوں۔“

میسم نے اپنا جمپرا اوپر کواٹھا کر سر سے کھینچ کر اتار دیا۔ اب وہ تقریباً بغیر شرٹ کے اُسکے سامنے پیٹھ کئے کھڑا تھا۔ ایک دفعہ تو زُباب کی آنکھیں شاک کی وجہ سے پوری کی پوری کھل گئیں۔ اُسکے کمر اور بازوؤں پر پڑے نیل دیکھ کر اتنا تواں اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اس وقت بہت زیادہ تکلیف میں تھا۔ مگر ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے

کریم کھولنے کے بعد ڈھیر ساری اپنی انگلیوں پر نکال کر دھیرے دھیرے ساری کمر پر لگانے لگی۔ اُسکے بعد بازوؤں کے اوپر حصے پر لگائی۔ آنکھوں سے سیال بہہ رہا تھا۔ یہ شخص میری وجہ سے اس تکلیف کا شکار ہوا ہے۔ یہ خیال بڑی پختگی کے ساتھ دماغ میں رقم ہوا تھا۔

اُس کے ہاتھ تھمے تو میسم نے ہلکی سی گردن موڑ کر بھنویں اچکائے۔
 ”کیا ساری لگ گئی؟“

اُس نے فقط سر ہلانے ہر اکٹھا کیا۔ میسم نے ایک جھٹکے سے جمپرواپس پہنا اور دیوار کی جانب بڑھا۔
 ”لائٹ بند کر دوں؟“

اُس کی انگلیاں سوچ بورڈ پر تھیں مگر وہ زباب کی مرضی جان رہا تھا۔
 ”ٹھہریں پہلے میں صوفے تک پہنچوں اندھیرے میں گری نہ جاؤں۔“
 وہ حیران ہوا۔

”صوفے پر کیوں۔۔؟“

”میں آپ کو تنگ نہیں کرنا چاہتی۔“

”یقین کرو میرا بیڈ دو کیا تین لوگوں کے لیے بھی کافی ہے۔ کئی دفعہ جب فیصل لوگ ادھر رکتے ہیں۔ تین لوگ آسانی سے سو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ فضول سے تکلف چھوڑو اور بیڈ پر جوئی مرضی سائیڈ لے لو۔ جلدی کرو تاکہ پھر میں لائٹ آف کروں۔“

وہ اتنے آرام و تحمل سے بیڈ کی جس مرضی سائیڈ پر لیٹنے کی آفر کر رہا تھا۔ جیسے دونوں کے درمیان نہ جانے کتنا پرانا بے تکلف رشتہ چلا آ رہا ہو۔ زباب کے اندر گہری بے چینی سرایت کرنے لگی۔
 ”میں آپکے ساتھ یوں ایک کمرے میں ایک بیڈ پر کیسے سو سکتی ہوں؟“

میسم پہلے حیران ہوا۔ پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ سر جھٹکتا ہوا اُس کے قریب آیا۔

پہلے تھوڑا قریب آیا پھر بہت قریب۔۔۔ وہاں پر گرمی تو بالکل نہیں تھی۔ مگر زباب کے ماتھے اور ناک کی نوک پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ وہ گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ جی چاہا دروازہ کھول کر بھاگ جائے۔ اس

فحص سے دور اس گھر سے دور پھر یک دم خیال آیا۔ یہاں سے بھاگ کر کہاں جائے گی؟۔۔۔

پچھلے سارے دروازے وہ آج اپنی طرف سے بند کر آئی تھی۔ وہ اُس کے سامنے کھڑا بڑے غور سے اُس کے ابرو کی ایک ایک جنبش دیکھ رہا تھا۔ ہونٹوں کا تھرکنا پلکوں کا لرزنا۔۔۔ بڑے نامحسوس انداز میں اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر اوپر اٹھائے اور اپنے گالوں سے مس کئے۔ دونوں طرف اپنے چہرے کے گرد زباب کے ہاتھوں کا ہالہ بنایا۔ زباب کو لگا جیسے بجلی کی تاروں کو چھو لیا ہو۔ جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔ زباب کے ہاتھوں کے اوپر اگر اُس کی اپنی گرفت نہ ہوتی تو وہ کب کی ہاتھ کھینچ چکی ہوتی۔

”زباب میری طرف دیکھو۔۔۔۔“

اُس نے جیسے سنا ہی نہیں اُس کا وجود کانپ رہا تھا۔ میسم کو شک ہوا جیسے وہ رو رہی ہے۔ اُس کا چہرہ ذرا سا اوپر کیا۔ شک کی تصدیق ہو گئی۔ بند آنکھوں کی باڑ سے آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔ میسم کے دل کو کچھ ہوا۔ انسان کی زندگی میں بُرا وقت آجائے تو وہ کہاں سے کہاں آجاتا ہے۔ زباب کی زندگی میں بھی ایسا بُرا وقت ہی آیا تھا۔ ورنہ وہ یہاں کبھی نہ ہوتی۔ یا پھر یہ حادثہ ہوا ہی ان دونوں کو ملانے کے لیے تھا۔ جو بھی تھا۔ اب وہ اُس کے سامنے اُس کے وجود کا حصہ بنی کھڑی تھی۔

کیسے، کیوں جیسے سوال سب عبث لگے۔ اُس نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اُسے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ مضبوط کیا۔ نہ جانے کتنی دیر یونہی اُس کو تھامے کھڑا رہا۔ پہلے وہ ہچکیوں سے روتی رہی۔ پھر صرف آنسوؤں سے اُس کے بعد ہلکی ہلکی سسکیاں رہ گئیں۔ میسم کے لب اُس کے تازہ ترین شیمپو ہوئے بالوں میں گم تھے۔ پھر یونہی کھڑے کھڑے وہ بالکل خاموش ہو گئی۔

میسم نے حیرت کے ساتھ خود سے یہ سوال کیا۔ ”کیا یہ سو گئی ہے۔۔۔؟“ اور وہ واقعی سو گئی ہوئی تھی۔ اُس کو بیڈ پر لٹا کر کیمبل اوڑھنے کے بعد لائٹ بند کر کے وہ خود بھی اپنی جگہ آکر لیٹ گیا۔ نیند کی وادی میں غافل ہونے سے پہلے اُس کے وجود کا اک ایک ریشہ اُسکی شرٹ کے سامنے حصے پر پھیلی تری پر فوکس تھا۔ وہ تری زباب کے آنسو تھے۔ جو اس وقت اُس کے پہلو میں سکون کی نیند سو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

گزرتے دنوں میں جہاں میسم کے زخم بھرے وہیں۔ زباب کے چہرے کی رونق واپس آئی تھی اور یہ سب خدیجہ کی محبت کا نتیجہ تھا۔ اُنکا بیٹا بھی کم نہیں تھا۔ اپنا سب کچھ اس کو سونپ چکا تھا۔ وہ اپنے قُرب سے اُسے باقی سب بھلانے کے مشن پر تھا۔ وہ اُسکی بات کا جواب تو دے دیتی مگر خود سے اُسے مخاطب نہ کرتی۔ مگر لیجہ اور خدیجہ کے ساتھ نارمل نظر آتی۔ بس میسم کو لگتا اُسی کے سامنے اپنے ان دیکھے خول میں بند ہونے کی کوشش کرتی ہے۔

آج اُسکا پہلا پیپر تھا۔ وہاں سے واپسی پر پانچوں دوستوں نے کلب میں کرکٹ کھیلی۔ وہیں پرڈز کا پروگرام بنایا۔ چاروں مل کر میسم اور زباب کو ڈر دینا چاہتے تھے۔ اگلے دو دن جھٹی تھی۔ اسلیے آج کا دن آئیڈیل لگا۔ کالی لونگ نیکر پر سفید سادی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں ٹریزرتھے۔

گاڑی سے نکل کر اُس نے ڈیکی سے اپنا سپورٹس بیک ٹکال کر کندھے پر ڈالا۔ اندر کو بڑھ رہا تھا۔ جب کچھ یاد آنے پر واپس گاڑی کی طرف آیا۔

اگلا دروازہ کھول کر ڈیش بورڈ پر رکھا خاکی لفافہ اٹھا کر اپنی ٹراؤزر کی پچھلی جیب میں اڑسا۔ کلب میں کھیل کود کی وجہ سے اُسکے سر کے بال پسینے سے چپکے ہوئے تھے اور رنگت دھک رہی تھی۔ اندر آ کر سیدھا سٹوروم میں گیا۔ کٹ ادھر رکھی۔ پھر کچن کی جانب آیا۔ وہاں صرف لیجہ موجود تھی۔

”اسلام علیکم۔۔۔ کیا بتا رہی ہو؟“

”وعلیکم اسلام جناب پہلے اپنی کارکردگی کا بتائیں پیپر کیسا رہا؟“

”اچھا گیا۔ بلکہ بہت اچھا گیا۔“

”ہاں جی آپ جیسے لوگ کہہ سکتے ہیں۔ جنہوں نے ہر چیز از بر کر رکھی ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا پیپر ہیں۔ کرکٹ کھیلی جا رہی ہے۔ ہر روز کہیں نہ کہیں آنا جانا ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ حال ہے۔ اور ایک ہم ہیں۔ مجال ہے جو کوئی چیز دو دن سے زیادہ یاد رہ جائے۔“

”بیٹا جی رٹے بازی کم کرو تو کچھ یاد بھی رہے۔ خیر امی کدھر ہیں؟“

”امی اپنی بڑی بیٹی کے ساتھ پڑوس میں گئی ہیں۔ ڈاکٹر شمسہ نے دونوں کو چائے پر بلایا تھا۔“

”کب تک آئیں گی؟“

”کیوں کیا اداس ہو گئے ہیں؟“

وہ فرنج میں سے انگور نکال کر ایک ایک دانہ ہوا میں اچھالتا پھر منہ سے کچھ کرتا۔

”اداس بھی ہوں۔ پر ایک جگہ ڈنر پہ جانا ہے۔ چھ بجے کا وقت ہے۔ اور اس وقت پانچ ہو چکے ہیں۔ اپنی سروس کا استعمال کرو۔ اور انکو بولو زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں گھر آ جائیں۔“

”وہ تو میں بول ہی دیتی ہوں۔ پر جواب میں آپکو بھی میرا ساتھ دینا پڑے گا۔ آج اگر آپکی بیوی نے مجھے اپنے ساتھ گھسیٹا تو آپ صاف انکار کر دیں گے۔ کہ ملیجہ کو ساتھ نہیں لے جاسکتے۔“ وہ انگور نگل کر ہنستے ہوئے بولا تو لہجے میں شرارت تھی۔

”دیکھو وہ تمہیں ساتھ لجا کر خود کو محفوظ سمجھتی ہے۔ میں اسکا دل نہیں توڑ سکتا۔“

”میں کچھ نہیں جانتی ہوں۔ کیونکہ آج میں نے اتنے شوق سے پیزا بنایا ہے۔ اسلیے باہر جا کر کچھ الم غلم کھانے کا موڈ نہیں ہے۔ اتنا ہی ہے۔ تو امی کو ساتھ جانے پر رضا مند کر لیں۔ میرا تو پہلے ہی آپ لوگوں کی دعوتوں کے چکر میں دو کلو وزن بڑھ گیا ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ تم ہمارے ساتھ جانا نہ چاہو تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ پھر جوڑ باب کے بنائے ایک کھاتی ہو۔ مزے مزے سے ڈبل کریم ڈال کر وہ بھی آج سے بند۔“

”ہائے بھائی سچی میں کہہ رہی ہوں۔ تم لوگ اپنی بیکری کھول لو۔ دنوں میں کاروبار چمک جائے گا۔ آج میں نے ان سے پائین اپیل ایک بنوایا ہے۔ واہ کیا مزے کا ہے۔“ وہ منہ بناتے ہوئے مزے کا یاد کر رہی تھی۔ میسم واپس فرنج کی جانب آیا۔ اندر جھانکا کیک نظر نہیں آیا۔۔ پیچھے سے ملیجہ کے ہنسنے کی آواز آئی۔

”مجھے علم تھا۔ آپ کو بس بتانے کی دیر ہے۔ ابھی کھانے بیٹھ جائیگے۔ اسلیے وہ کیک میں نے یہاں رکھا ہی نہیں ہے۔ جائیں جا کر تیار ہوں۔ میں بھابھی کو لیکر آتی ہوں۔“ وہ دونوں آگے پیچھے کچن سے باہر آئے۔ میسم ایک ایک جست میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چلا گیا۔ ملیجہ کا رخ گیٹ کی جانب تھا۔ وہ تیار ہو کر شیشے کے سامنے کھڑا بال بنارہا تھا۔ جب وہ اندر آئی۔

اُس نے گرے رنگ کی لونگ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ جس کے ساتھ گرے رنگ کا ہی چوڑی دار پاجامہ تھا۔ شرٹ کے گلے بازو اور گھیرے پر اور نچ رنگ سے دھاگے کی کڑھائی ہوئی تھی۔ ساتھ میں میرون رنگ کی پامپنگ تھی۔ اسی طرح اور نچ رنگ کے دوپٹے کے چاروں اور بیل بنانے کے بعد پامپنگ بھی کی گئی تھی۔ فرنیچ ٹیل چوٹی میں سے نکلنے والی آوارہ لٹیس دوپٹے کے اندر سے جھانک رہی تھیں۔ پیروں میں میرون رنگ کا سادہ چڑے کا کھسہ تھا۔

”اسلام وعلیکم میں آنٹی کے ساتھ گئی تھی۔“

وہ وہیں دروازے کے پاس پڑے ڈیک کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

”وعلیکم اسلام۔۔۔ جی جناب ملیحہ بتا چکی ہے؟ ہمیں ڈنر پہ جانا ہے۔ کیا تم تیار ہو۔۔۔؟“

”ہاں میں نے یہ کپڑے تھوڑی دیر پہلے ہی پہنے تھے۔ مگر ایک مسئلہ ہے۔“ وہ چہرے سے ہی پریشان اور سنجیدہ لگ رہی تھی۔ میسم جیسے اُس کا مسئلہ جان گیا تھا۔ اپنے اوپر پر فیوم چھڑک کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا براؤن لفافہ تھام کر اُس کے قریب آیا۔

”تمہیں نہیں لگتا۔ اب ہم اتنے چھوٹے بچے نہیں ہیں جنہیں باہر جاتے وقت ایک عدد سیکورٹی گارڈ ساتھ لیکر جانا پڑے۔“ بولنے کے ساتھ ساتھ وہ خاکی لفافے میں سے موچے کے گجرے نکال کر اُسکی دونوں کلائیوں میں پہنا گیا۔ پھر زباب کی گھبراہٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے۔ اُسکے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر پھولوں کو سونگھا۔ گورے گورے ہاتھوں میں اس وقت سوائے اُن گجروں کے اور کوئی بھی آرائش کی چیز نہیں تھی۔ اور وہ اتنے سے ہی سچ گئے۔ کسی اور سنگھار کی ضرورت نہ رہی۔

”تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ جب وہ بے باکی سے بولنے پر آتا تھا تو زباب کو اپنی سانس اٹکتی محسوس ہوتی۔ یوں لگتا جیسے ارد گرد آکسیجن کی کمی ہو گئی ہو۔ ابھی بھی اپنا ہاتھ جھمکاتے ہوئے۔ فقط اُسکے اور اپنے درمیان فاصلہ پیدا کرنے کے لیے الماری کا پٹ کھول کر کچھ ڈھونڈتے ہوئے بولی۔

”آپ جیسے انسان کو کم از کم مجھے بہلانے کے لیے ایسے جھوٹ کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔“

الماری کا وہ حصہ اب صرف زباب کے لباس سے بھرا ہوا تھا۔ اُس نے وہ پٹ بند کر کے دوسرا کھولا۔

وہ ناگہی سے اُسکودیکھتا ہوا۔ ایک دفعہ پھر اُسکے قریب آیا۔ اور الماری کے بند والے پٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر اُسکے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس بات کا کیا مطلب لوں؟ میں نے کیا جھوٹ کہا ہے۔؟“

”یہی جو ہر روز کہتے ہیں۔ بڑی پیاری لگ رہی ہو۔“

”ہاں تو اس میں کیا جھوٹ ہے؟“

پوچھنے کے ساتھ ہی اُس نے ہلکے سے کھینچ کر اُس کے سر پہ موجود آنچل ڈھلکایا۔

رُباب نہ جانے الماری میں سے کیا ڈھونڈنے کی کوشش میں تھی۔

”کوئی انسان ہر روز تو اچھا نہیں لگ سکتا۔ کسی ایک دن بائے چانس اچھا لگ جائے تو کوئی مانے بھی۔ آپ تو ہر روز یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ حالانکہ آج کام کرنے والی کہہ رہی تھی۔ باجی یہ رنگ آپ پر کھلا نہیں ہے۔ جس دن کالا رنگ پہنتی ہیں۔ اچھی لگتی ہیں۔“ میسم کی جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

”فارگا ڈسک رُباب تم پہلے اُس کام والی کو میری آنکھیں نکال کر لگاؤ۔ پھر اُسکو پوچھنا کہ تم کیسی لگ رہی ہو۔ جب میں کہتا ہوں۔ تو اسکا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے ہر رنگ و روپ میں اچھی لگتی ہو۔ جب تم صبح اٹھتی ہو۔ بال سارے بکھرے ہوتے ہیں۔ آنکھیں اور زیادہ موٹی لگ رہی ہوتی ہیں۔ تمہارے چہرے کی جلد میں سے گلابی رنگ چھلک رہا ہوتا ہے۔ اُس وقت سب سے زیادہ خوبصورت لگتی ہو۔ مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا تم اچھے سے ڈریس اپ ہو کر میک اپ وغیرہ کرو یا سادہ سے خلیے میں اُداس سا چہرہ بنا کر بیٹھی رہو۔ مجھے تم ہر حال میں خوبصورت ہی لگتی ہو۔“

وہ ہاتھ روکے ساکت کھڑی اُسکون رہی تھی۔

”میسم ایسا کہیں نہیں ہوتا اور کبھی بھی نہیں ہوتا۔“

”ہاں میں جانتا ہوں۔ تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ میں تمہیں بالکل بھی اچھا نہیں لگتا ہوں۔ پر مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ فقط ایک نئے بننے والے رشتے کو قبول کرنے میں تم اتنا وقت لے رہی ہو۔ نئے شخص سے محبت کرنے کے لیے تو اور بھی زیادہ عرصہ درکار ہوگا۔ میرا کیس تو بڑا آسان تھا۔ میری کسی سے کبھی کوئی

کمٹنٹ نہیں رہی ہے۔ نہ تم سے پہلے کوئی مگیت رہی ہے۔ میری زندگی میں آنے والی تم پہلی لڑکی ہو اور میں نے پہلے دن سے اپنے دل اور گھر کے تمام دروازے، کھڑکیاں، روشن دان سب کھول دیئے ہیں۔ اس لیے میرا ضمیر پر سکون ہے۔ میرے اندر کوئی جنگ نہیں ہے۔“

”اگر آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں اب بھی اپنے سابقہ رشتے کو لیکر اُداس رہتی ہوں تو آپ غلط سوچتے ہیں۔ نہ کل مجھے اُس رشتے سے دلی لگاؤ تھا۔ نہ آج اس رشتے کو سمجھ پارہی ہوں۔ وہ بھی بڑوں کا فیصلہ تھا۔ اور یہ تو جو کچھ ہوا آپ بہتر جانتے ہیں۔“

”خیر یہ ایک لمبی بحث ہے۔ اس وقت ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو چلیں؟“

”کیا آج کاؤنر کینسل نہیں ہو سکتا ہے؟“

”کیوں۔۔؟“

”کیونکہ ملیجہ نہیں مان رہی ہے۔ وہ کہتی ہے۔ آج نہیں جاسکتی۔“

”ہاں تو کونسی زبردستی ہے۔ کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟“

”نہیں۔۔۔“

”تو پھر۔؟“

”مجھے لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔“

”تمہارے اور میرے درمیان لوگوں کا کیا لین دین ہے اگر ہماری شادی نارمل انداز میں ہوئی ہوتی۔ کیا تب بھی تم ایسا سوچتیں۔۔؟“

اُس نے آخر کار الماری میں لٹکی ہوئی ٹائیوں میں سے میرون ٹائی نکال کر میسم کی طرف بڑھائی۔ جس نے بیلو جینز کے ساتھ سفید رنگ کی پلین کاٹن کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں براؤن ڈریس شوز تھے۔ اُس نے ٹائی تو تھام لی مگر نظریں سوالیہ انداز میں رُباب کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جو جواب دینے سے ڈر رہی تھی۔ کیونکہ جو وہ پوچھ رہا تھا۔ وہ اگر سچ بتاتی تو وہ برداشت نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ ٹالنے کے موڈ میں بولی۔

”ڈنر کی دعوت کس کی طرف سے ہے؟“

”قیصر، شہباز اور فیصل لوگ کی جانب سے ہے۔ چاروں نے مل کر دعوت دی ہے۔“
وہ شیشے کے سامنے ہو کر ٹائی باندھتے ہوئے بتانے لگا۔ تو زباب کی حیران سی آواز سنی۔۔
”کیا وہاں آپ کے چاروں دوست ہونگے؟“

”ظاہری بات ہے۔ یار۔۔۔“

”پلیز۔۔۔ میری جانب سے اُن لوگوں سے معذرت کر لیں۔ ویسے بھی ہم تینوں کے گھر والوں کی جانب سے کھانے پر بلائے گئے ہیں۔ اُسکے بعد تو آج کی دعوت بنتی ہی نہیں ہے۔“
”یار یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ ہم لوگ عام روٹین میں بھی کھانے کے ایسے پروگرام بناتے رہتے ہیں۔ آج بس فرق یہ ہے۔ کہ تم بھی میری گینگ میں شامل ہو رہی ہو۔ اور یہ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ کیونکہ آج تک ہمارے گروپ میں کبھی کوئی لڑکی انوائٹ نہیں ہوئی ہے۔“
”اور اگر میں یہ کہوں کہ مجھے یہ اعزاز نہیں چاہیے؟“

ایک پل کو اُس نے زباب کے عکس کو شیشے میں دیکھا جواب پہلے سے بھی بیڈ کہ چادر کو ہاتھ سے ٹھیک کر رہی تھی۔ جیسے ارادتا مصروف رہنا چاہ رہی ہو۔

”یہ بہت انکورنٹ جواب ہے۔ پر تمہاری اپنی مرضی۔۔۔ تم نہیں جانا چاہتی ہو تو میں فون کر کے اُن لوگوں کو منع کر دیتا ہوں۔ جو کہ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ کیونکہ ڈرنہ بھی کرنا ہو۔ ہم صرف اُنکے ساتھ ایک کپ چائے پی کر واپس آ سکتے ہیں یا کہیں اور دونوں اکیلے ڈنر کر سکتے ہیں۔ آگے جو تم کہو۔۔۔۔۔“
زباب نے ہاتھ میں پکڑا تکیہ بیڈ کے درمیان میں بٹھا۔

”میں آپ کے اس رویے سے تنگ آ گئی ہوں۔ ایسا کونسا انسان ہوگا جسکو کالے چورسی پھینٹی لگا کر اُسکی شکل کا نقشہ بدل دیا جائے پھر زبردستی اپنی بیٹی کی شادی اُس سے کروادی جائے۔ اُن داسپاٹ رخصتی ہو۔ مگر اُس آدمی کو ان سب باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں۔۔۔؟ جتنا آپ میرے ساتھ اچھے انداز سے پیش آتے ہیں۔ میرا نہیں خیال جن لوگوں کی پسند سے شادیاں ہوتی ہیں۔ وہ بھی اپنی بیویوں کے ساتھ اتنا نرمی سے پیش آتے ہوں گے۔ آپ کو غصہ کیوں نہیں آتا؟ بجائے اپنے دوستوں کے سامنے مجھے اور میری فیملی کو بُرا بھلا

کہنے کے۔ آپ ایسے مزے سے دعوتیں کیش کر رہے ہیں۔ جیسے نہ جانے کتنی صدیوں سے میرے عشق میں پاگل تھے۔“ وہ ایک ہی سانس میں ساری بات ختم کر کے اب خوفزدہ نظروں سے اُسکو دیکھ رہی تھی۔ جو بڑے تحمل سے ڈرینگ کے ساتھ ٹیک لگا کر سینے پہ ہاتھ باندھے اُسکونں رہا تھا۔

”جانتی ہو اس سب میں خوبصورت بات کیا ہے؟“

اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”تم۔۔۔ ہاں انا کو چوٹ لگی۔ مان لیا، پر یہ بھی تو دیکھو اُن لوگوں نے ایک جتیا جاگتا جیون سا تھی میرے حوالے کر دیا ہے۔ یار میں انسان ہوں۔ کوئی کافر تو نہیں ہوں۔ جن حوروں کے لیے لوگ جنت کی خواہش کرتے ہیں۔ اُن میں سے ہی ایک بہترین کردار و اخلاق کی مسمرائز کرنے والی شکل و صورت کی لڑکی میرے گھر میں میرے بیڈروم میں میرے سامنے میری بیوی کے روپ میں موجود ہو اور تم چاہتی ہو۔ میں اُس سے منہ موڑ کر اپنی دوا بچ کی انا کو پوجتا رہوں؟ وائے داہیل آن ارتھ آئی ووؤڈ ڈو دیٹ؟ وائے ووؤڈ اِنی باڈی ڈو دیٹ۔۔۔؟ کوئی عقل و شعور رکھنے والا مرد ایسا نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر وہ کسی اور جگہ سردیے بیٹھا ہوگا۔ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیا اب ہم باہر جاسکتے ہیں؟“

وہ اپنا والٹ جیب میں ڈالتے ہوئے۔ دروازے کی طرف جاتے پوچھ رہا تھا۔ مجبوراً رُباب کو نہ چاہتے ہوئے بھی اُسکے پیچھے آنا پڑا۔ رُباب اُس تک اپنے دل کے اصل جذبات پہنچانے میں ناکام ہوئی تھی۔ اندر ہی اندر وہ میسم کے ان منہ زور جذبات سے خائف ہو چلی تھی۔ دوسرا اُسکی اپنی صحت اُسکے لیے پریشانی کھڑی کر رہی تھی۔ جس کے بارے میں اُس نے ابھی تک کسی کو نہ بتایا نہ کچھ پوچھا تھا۔

خدیجہ نے باخوشی دونوں کو زخمت کیا۔ سارا راستہ وہ اُسکو کوئی دس دفعہ بتاتی گئی۔

”میں آپکے دوستوں کے ساتھ ڈنر نہیں کروں گی۔“ وہ مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیتا۔ ریسٹورنٹ کے پارکنگ میں گاڑی روک کر وہ اُسکی جانب مُڑا۔۔۔

”ہم صرف اندر جائینگے۔۔۔ سلام دعا کر کے کوئی بہانہ بنا کر واپس نکل آنا ہے۔ تم راضی ہو؟“ اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ لوگ اندر آئے تو نہ صرف وہ چاروں موجود تھے۔ بلکہ انکی کلاس کے کچھ اور لڑکیاں لڑکے بھی تھے۔ میز کی ڈیکوریشن خاص نیولی ویڈ کے تھیم سے کردائی ہوئی تھی۔ چاروں نے میسم کے گلے لگ کر اُسکو مبارک دی۔ باقی سب نے بھی ایسا ہی کیا۔ لڑکیوں نے زباب کے ساتھ ہاتھ ہلا کر گریٹ کیا۔

سب سے پہلے اُن سب نے کیک منگوا یا۔ جسے اُن دونوں سے کٹوایا۔ زبردست قسم کی ہونٹنگ اور شور میں اُن دونوں نے کیک کاٹا۔ میسم نے سب کا منہ میٹھا کر دیا۔ لڑکیوں کی جانب سے بہت اصرار کے بعد زباب شرماتی گھبراتی نے میسم کا منہ میٹھا کر دیا۔ وہ لوگ جو سوچ کر آئے تھے۔ آگے سے ملنے والے پیار نے اُس پروگرام پر عمل نہ کرنے دیا۔ سب نے مل کر ڈنر کیا۔ اُس سے پہلے انہیں گفٹ دیئے گئے۔ وہ آتے وقت جتنی ناخوش تھی۔ اپنے ہم عمر لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ وہ واش روم تک آئی۔ ابھی ہاتھ دھو رہی تھی۔ جب میسم کی کلاس کی دو لڑکیوں کی آواز کانوں میں پڑی۔

”یار یہ دونوں تو بڑے گھنے نکلے۔ آرام سے تین چار سال سب کی آنکھوں سے چھپا کر افیئر چلایا۔ اب اگر سب کو پتا چلا تب بھی اتنی خوش نصیبی ہے کہ درمیان میں کوئی ظالم سماج ہی نہیں آیا۔ زباب عالم شکل سے ایسی لگتی تو نہیں تھی۔“ زباب اپنی جگہ پر ہل بھی نہ سکی۔ جبکہ دوسری بولی۔۔۔

”ارے معصوم شکلوں والے ہی گھنے ہوتے ہیں۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا سب سے ہینڈسم لڑکا لے اڑی ہے۔ نہ جانے کتنے دلوں پر ظلم کیا ہے۔“ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستی ہوئیں وہاں سے چلی گئیں۔ زباب ہاتھ دھو کر باہر نکلی۔ سامنے قد آدم آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا تو آنکھیں ڈبڈبائی ہوئیں تھیں۔ وہ خود سے مخاطب ہوئی۔

”تو اب یہ میری زندگی ٹھہری؟ سب سے ہینڈسم لڑکے کو پٹا کر شادی کرنے والی لڑکی؟ سب میری پیٹھ پیچھے مجھے ایسے ہی القابات سے نوازتے ہوں گے۔ کیا اس ساری عمر یہی سنتے گورنی ہے۔ وہ جارہی ہے۔ زباب عالم جس کے ماں باپ نے اُسکو دھتکار دیا۔ کیونکہ وہ بد کردار تھی۔“

اُس کو لگا وہ الٹی کر دئے گی۔ اس لیے واپس اندر کو بھاگی۔۔۔

واپسی کا سارا راستہ وہ بہت خاموش رہی تھی۔ میسم نے ایک دو دفعہ پوچھنا چاہا مگر وہ نقلی مسکراہٹ دیکھا

کرا سکو نال گئی اور ایسا اگلے کئی دن تک ہوتا رہا۔ پہلے وہ اسکی باتوں کا جواب تو دیتی تھی۔ اب وہ بھی بند کر دیا۔
 خدیجہ نے طلال کے ساتھ مشورہ کر کے زباب کو وہاں بھیج دیا۔ میسم سے چھپانا اسلیے ضروری ہو گیا۔ کیونکہ
 اگر اسکے علم میں آ جاتا زباب ماں بن رہی ہے اور کراچی میں رہتی ہے۔ تو وہ شام سے پہلے جا کر اسکو لے آتا۔
 جبکہ وہ آنا چاہتی ہی نہیں تھی۔ یہ رشتہ بھی قائم رکھنا نہیں چاہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

خدیجہ بیٹے کے چہرے پر آج اتنے عرصے بعد سکون مسکراہٹ دیکھ کر اندر تک شانت ہو گئی تھیں۔ ملیجہ کی
 ساس سے زباب کو ملوانے کے کیے اسکو لینے آئیں۔ مگر اندر آتے ہی زباب کی حالت نے اُنکو دہلا دیا۔ ہریرہ کو
 گود میں لیے رو رو کر آنکھیں نہجائی ہوئیں تھیں۔

”راہی میری جان یہ کیا؟“

اُس سے بولا کچھ نہیں گیا۔ بس اُنسو ایک دفعہ پھر پوری سپیڈ سے بہنے لگے۔
 خدیجہ نے سب سے پہلے تو دروازہ لاک کیا۔ پھر اسکی گود سے ہریرہ کو اٹھا کر بیڈ پر ڈالا۔
 اپنے دوپٹے کے پلو سے زباب کا چہرہ صاف کیا۔ اور پانی کا گلاس بھر کر اسکے لبوں سے لگایا۔
 اُس نے بمشکل دو گھونٹ ہی بھرے اور گلاس پرے ہٹا دیا۔
 ”کیا ہوا ہے؟“

”وہ کہتے ہیں۔ وہ ہریرہ کو میرے ساتھ نہیں رہنے دیں گے۔“
 خدیجہ کو خاک سمجھ نہ آیا۔ مگر وہ ایک دفعہ پھر ہچکیاں بھر رہی تھی۔
 ”کیا مطلب ساتھ نہیں رہنے دے گا۔ وہ بھی اسی گھر میں ہے۔ تم بھی ادھر ہو۔ ہریرہ بھی ادھر ہے۔“
 ”وہ کہتے ہیں۔ وہ مجھے طلاق صرف تب دیں گے۔ جب میں ہریرہ کو ہمیشہ کی لیے اُنکے حوالے کر دوں گی۔“
 ”آئی بھلا میں کیسے جیوں گی؟“

خدیجہ نے اسکو اپنے ساتھ لگالیا۔

”تم دونوں ہی پاگل ہو۔ آتے ہی لڑائی اور شرطیں رکھنی شروع کر دی ہیں۔ جب تک تو میں زندہ ہوں۔“

تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہریرہ کو تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اُس بندر سے تو میں ابھی جا کر پوچھتی ہوں۔ اتنے عرصے بعد میری بیٹی گھر آئی ہے۔ اور آتے ہی اُسکو زلا رہا ہے۔ تم ہریرہ کے ساتھ ہی سو جاؤ۔۔۔ ملیجہ کے سُسرال والے ڈنکر کے ہی جائیں گے۔ آج مگنی کی ڈیٹ لینے آئے ہیں اور تمہارا اُنکے درمیان ہونا بڑا ضروری ہے۔“

”نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ملیجہ بھی کہتی ہوگی۔ کیسی بہن ہے۔ میرا خوشی کا موقع ہے۔ اور یہ اندر بیٹھی رو رہی ہے۔ آپ مجھے صرف پانچ منٹ دیں۔ میں فریش ہو جاؤں۔ اس حالت میں تو میں بہت ہی بُری نظر آ رہی ہوں۔“ خدیجہ خوشی سے مُسکراتے ہوئے۔ اُسکی پیشانی چوم کر ایک دفعہ پھر اسکو ہر فکر سے آزاد رہنے کا بول کر وہاں سے نکل گئیں۔

پورے پانچ منٹ بعد وہ ہریرہ کو گود میں اٹھائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو چہرے پر تازہ ہلکی ہلکی بیس لگا کر لائینر اور لپ گلوں سے کچھ دیر پہلے والی ابتر حالت مٹھا چکی تھی۔ بالوں کو برش کر کے دو چار بل دینے کے بعد پونی ڈالی ہوئی تھی۔ لباس بھی بدل کر جامنی ڈیزائن والا کرتا ساتھ میں کچے پیلے رنگ کا ٹراؤزر تھا۔ دونوں رنگوں کے امتزاج کا دو پٹہ سلیقے سے سر پر لیا ہوا تھا۔ ایک بیٹے کو جنم دینے کے باوجود اُسکی جسامت سے لگتا نہیں تھا۔ ایک بچے کی ماں ہے۔ بلکہ چہرے پر مزید شادابی آگئی تھی۔

ہریرہ کو وہ جان بوجھ کر نیند سے جگا کر ساتھ لائی تھی۔ کیونکہ اُسکی شخصیت میں ایک مقناطیسی اثر یہ تھا۔ وہ جہاں ہوتا تھا لوگوں کا دھیان سارا اُسی کی جانب رہتا اور اس وقت زباب کو یہی چاہیے تھا۔

”اسلام علیکم۔۔۔ میں معذرت چاہتی ہوں۔ اصل میں ہریرہ نے مجھے اپنی خدمت میں مصروف کر رکھا تھا۔“

ملیجہ کی ساس سُسر اور نند سے سلام لینے کے بعد بڑے اعتماد سے آکر ڈبل صوفے پر بیٹھے میسم کے برابر میں بیٹھ گئی۔ میسم نے براہِ راست نظر نہیں ڈالی مگر دھیان سارا اُسی کی جانب تھا۔ پہلو میں آکر بیٹھی تو لگا دل اسی جانب دھڑکنے لگا ہے۔ اپنی حالت پر وہ اندر ہی اندر وہ خوفزدہ ہوا تھا کیونکہ اس دفعہ وہ اپنے دل کی بجائے دماغ کی صدا پر لبیک کہنا چاہتا تھا۔ ملیجہ کی ساس نے ہریرہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اُسکی بیٹی نے ہریرہ کو زباب کی گود

اُسکو کندھے سے تھام کر سیدھا نہ کرتا تو یقیناً زباب کا سردیوار سے ٹکرانے میں دو تین انچ کی دوری پر ہی رہ گیا تھا۔ وہ جخل سی ہو کر اپنا دوپٹہ سیدھا کرتی ایک طرف ہو گئی۔ دل میں سوچا یا اللہ کیا پہلے والی ملاقات میں جان نکلنے کی کوئی کسر رہ گئی ہے۔ جواب ٹکڑ بھی اس پہاڑ سے کروادی۔ اس سے بہتر تو دیوار میں ہی جا لگتی۔ میسم نے لٹنی کو گھورا۔

”کبھی انسان بننے کا پروگرام ہے یا ساری عمر یونہی جانوروں کی طرح کھانے میں اور اُچھل کود کرنے میں گزارنی ہے؟“

”اب یہ تو آپ کا قصور ہے۔۔۔“

لٹنی کی بات پر اُس نے ماتھے پر تیوری لیے پوچھا۔ ”اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”دیکھیں ناں آپ نے شادی کی انسان بن گئے۔ انسان تجربے سے ہی سیکھ لیتا ہے۔ اب میں کیا اپنے منہ سے بولوں کہ بھائی میری بھی شادی کروادو۔“

”پہلے اپنا وزن دیکھا ہے۔ تم سے شادی کرے گا کون؟“

”ظاہری بات ہے۔ کوئی جگرے والا مائی کالا لال ہی کرے گا۔ ویسے وہ آپ کا دوست کیسا ہے؟“

جواب میں میسم نے وہ آنکھیں دیکھائیں۔ لٹنی کو اپنے سوال کا جواب بھول ہی جانا پڑا۔ پھر بھی باز نہیں آئی

”بھائی نہیں بتانا تو نہ بتاؤ۔۔۔ ڈرا کیوں رہے ہو۔ اب تمہارا دوست اتنا بھی حسین نہیں ہے۔ وہ تو بس اُسکی شکل ایڈیم سنڈلر سے ملتی ہے۔ تمہیں تو علم ہے۔ ایڈیم میرا پسندیدہ اداکار ہے۔ اب میں اُسکو ملنے کے لیے اتنی دور ہالی وڈ جانے کی اس استطاعت تو نہیں رکھتی۔ اس لیے اس دو نمبر کے ایڈیم کو دیکھ کر اپنا شوق پورا کرنا چاہتی ہوں۔ اب آپ نہ جانے کیا سمجھیں۔۔۔ خیر مجھے کیا۔۔۔“

”تمہیں ناں میں بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میرے ساتھ خواہ مخواہ میں فری ہونے کی کوشش نہ کرو۔ میں تم سے ناراض ہوں۔“

”میرے سے کیسی ناراضگی۔ اپنی بیگم سے پوچھیں اُسی نے ہمیں گناہگار کیا ہے۔“

”جو مرضی کہہ لو۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ اور ملی بیٹے جلدی سے کھانا لگوادو۔ مہمان جلدی میں ہیں۔“

”لہٰذا کو جواب دینے کے بعد ملیجہ کو پیغام دیکروہاں سے نکل گیا۔

”میسم بھائی کو تو بات چاہیے ہوتی تھی۔ اگلے بندہ کا وہ ریکارڈ لگاتے تھے۔ کہ اللہ کی پناہ اب بات ہی ٹال گئے۔ ہاؤسٹرینج۔۔۔۔۔“

لہٰذا نے حیرت کا اظہار کیا۔ جس پر ملیجہ نے گہرا سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”اب وہ ایسے ہی ہو گئے ہیں۔ فٹنٹ غصہ چڑھ جاتا ہے اور پھر خاموشی کا روزہ رکھ کر گھومتے رہتے ہیں۔ اب بھابھی آگئی ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ پہلے والے میسم بھائی بھی واپس آجائیں۔“ سلاڈ کے چٹوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے زباب ایسے بن گئی۔ جیسے اُن لوگوں کے درمیان موجود ہی نہ ہو۔

”سن رہی ہو؟“ لہٰذا نے زباب سے چھوٹی تھی۔ مگر اس گزرے ایک سال میں دونوں کے درمیاں اتنی دوستی ہو گئی ہوئی تھی۔ آپ جناب جیسے الفاظ کب کے بیکار ہو چکے تھے۔ اب بھی وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر زباب کو گھور رہی تھی۔

”میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”صدقے جاؤں اس معصوم بھولی صورت کے۔ بی بی جی آپ بھائی کے سامنے میری صفائی دیکر ہماری صلح کروائیگی۔“

”ہاں جیسے میرے الفاظ کا اُن پر بڑا اثر ہونا ہے۔ میرے بغیر ہی مذاکرات کرو۔ تو کامیابی کا چانس زیادہ ہے۔“

”ہم دیکھیں گے۔ پہلے تو آج کی مگنی ذرا فائل ہو جائے۔ کہیں پہلے والے کپڑے پڑے پڑے پڑانے ہو گئے تو میری امی کا چالیس پچاس ہزار کا خرچہ بڑھ جاتا ہے۔ اگر امی کا نہ بڑھا تو خالہ کا تو ضرور بجٹ خراب ہونا ہے۔“

”مجال ہے جو کبھی تم کپڑوں کی باتوں سے باہر نکل آؤ۔ بورلڑکی۔۔۔“ بلال اُکتایا ہوا۔ وہاں سے ہٹ گیا۔

”لو انکو بھی سُنو خود کبھی نہانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ دوسروں کو بور کہہ رہے ہیں۔“

ڈنر سب نے اکٹھے کیا۔ ہریرہ ماں کی بجائے دادی کو گود میں رہا۔ کھانے کے بعد چائے پیٹتے ہی ملیجہ کے سسرال والے چلے گئے۔ تین دن بعد کی ڈیٹ رکھی تھی۔ کیونکہ لڑکے کے ماموں نے اسی ہفتے ڈیٹ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ اسلیے اسکی بہن کی خواہش تھی۔ اُنکا بھائی بھانجے کی منگنی دیکھ کر ہی جائے۔ خدیجہ اور طلال احمد کے لیے تیاری کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ بیٹے کی شادی پر تو اتنا سا خرچہ بھی نہیں آیا تھا۔ مہمانوں کو الوداع کرنے کے بعد وہ لوگ اس وقت سیٹنگ روم میں ہی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ طلال احمد بلائے جانے والے مہمان گنوا کر بلال سے لسٹ بنوا رہے تھے۔

”باب ملیجہ اور لہنی لیپ ٹاپ کے گرد بیٹھ کر مختلف ڈیزائنرز کے پارٹی ویئرز نکال نکال کر دیکھ رہی تھی۔“
 ”پتا کیا کرو۔ کل مارکیٹ جاؤ اور بتا دینا جو آخری دو خاص آرڈر دیکر بنوانے کا اب وقت نہیں ہے۔“ زباب کے مشورے پر ملیجہ نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

”انکو چاہیے تھاناں کم از کم دو ہفتے کا ہی وقت رکھ لیتے۔ اب ریڈی میڈ میں کوئی اچھا پیس نہ ملا تو پھر۔۔۔“
 ”یار مل جاتا ہے۔ سب مل جاتا ہے۔ تم بس خالہ سے پوچھ کر جوڑے کا بجٹ فائل کرو۔ باقی سر درد میری ہے۔“ لہنی پوری طرح ایک ایک تصویر کو پڑھتے ہوئے لا پرواہی سے بولی تو زباب کو ہنسی آ گئی۔
 ”یہ سچ کہہ رہی ہے۔ قسم سے ہر دفعہ یہ ریڈی میڈ کپڑے ہی لاتی ہے اور ظالم ہر جوڑا ایک سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے۔ بجٹ اسکا ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔“

”خاک کھلا ہوتا ہے۔ اس دفعہ مجھے صرف اور صرف چالیس ہزار ملا تھا اور اُس میں بھلا کیا آتا ہے۔ لینے جاؤ تو ایک قربانی کا بکرا بھی نہیں آتا اور مجھے حکم ہوا تھا۔ تین جوڑے، تین جوتے، ہینڈ بیگ، جیولری، میک اپ، ہر ایک چیز اسی چالیس کے اندر لینی ہے۔ وہ تو شکر ہے۔ میرے پاس پہلے سے ایک آدھ جوڑا پڑا ہوا تھا۔ ورنہ میں یہ منگنی کیسے دیکھ پاتی۔“

”توبہ کرونا شکری لڑکی۔۔۔“ زباب نے ہمیشہ کی طرح اُسکو شرم دلانی چاہی۔

”ہاں تو محنت کم تو نہیں کرتی ہوں۔ سارا دن ایک ٹانگ پہ گزرتا ہے۔“

”اور افسوس کہ تمہارا وزن پھر بھی کم نہیں ہوتا۔“

بلال کی بات پر اُسکو آگ ہی لگ گئی۔

”آرام سے بیٹھے رہو۔ گینڈے اپنی شکل کبھی شیشے میں دیکھی ہے۔“

اندر آتے ہوئے خدیجہ نے مداخلت کی۔

”اچھا بس بس تم دونوں اب دس بارہ سال کے بچے نہیں ہو۔ ماں باپ رشتے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ تم

لوگ ہو کہ ابھی بھی جانوروں کی طرح لڑتے ہو۔“

لُٹنی سب بھول کر آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔۔۔ ”ہائے خالہ کیا یہ سچ ہے؟“

”کیا۔۔۔؟“ خدیجہ کی سمجھ ہی نہ آیا بھانجی آخر کیا پوچھ رہی ہے۔

”یہی جو آپ کہہ رہی ہیں۔ کیا واقعی امی میرا رشتہ دیکھ رہی ہیں؟ پلیز اُنکو میری طرف سے بتا دیجئے گا۔ میں

چاہتی ہوں۔ میرا سسرال لاہور کا ہو۔“ بلال نے نشانہ باندھ کر گُشن اُسکو مارا ساتھ ہی گھوری لیے بولا۔

”حرام ہے جو تمہیں ذرا شرم آئے۔ یہ بھی لحاظ نہیں کرتی ہو کہ خالو پاس بیٹھے ہیں۔“

”ہائے تو خالو کونسا غیر ہیں۔“

لُٹنی کی ڈھٹائی یونہی سب کو ہنستے رہنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

طلال احمد بھی مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھے۔ آگے بڑھ کر لُٹنی کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

”بیٹا اگلی دفعہ خالو کو اشاروں اشاروں میں یہ بھی سمجھا دینا لاہور کی کس گلی اور کون سے مکان میں رشتہ لیکر جانا

ہے۔ میں اپنے بھائی بہن کو سیدھا وہاں لیجاؤں گا۔“

لُٹنی اپنے دوپٹے کا پلو منہ میں رکھ کر شرمانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔۔۔

”ہائے اللہ ہر کسی کو میرے خالہ خالو جیسے خالہ خالو دیں۔“

”اچھا اب مسکا بند کرو اور جا کر سو جاؤ۔ ورنہ بارہ بجے سے پہلے تم اُٹھتی بھی نہیں ہو۔ کل بازار کا چکر لگنا

ہے۔ ویسے بھی تم لوگ آج سفر کے تھکے آئے ہو۔ اُٹھو باب بیٹی جا کر آرام کرو۔ تمہارا سامان اوپر تمہارے

کمرے میں چلا گیا ہوا ہے۔ اور بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔ ملی ذرا بھائی کو فون کرو ہریرہ کو لیکر گیا ہوا

ہے۔ جلدی گھر آئے۔“

ملیجہ نے لیپ ٹاپ بند کر کے ٹیبل پر ڈال دیا۔ لہنی کو واقعی نیند آرہی تھی۔ وہ اٹھ کر ملیجہ والے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ بلال بھی شب بخیر بول کر خالو کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گیا۔ رباب کو نیند تو آرہی تھی۔ مگر وہ ہریرہ ہی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جسکو میسم نہ جانے کہا لیکر نکلا ہوا تھا۔

”آنٹی میں اوپر جاتی ہوں۔ پلیز جب ہریرہ آئے تو مجھے بتا دیجئے گا۔“

”کیوں نہیں بیٹی۔“

”ٹھہریں ذرا۔۔۔“ ملیجہ کی آواز پر وہ رک گئی۔ اُس نے اپنے ٹراؤزر کی جیب سے نمبروں والا فون برآمد کر کے رباب کے ہاتھ میں دیا۔

”اس میں بیلنس بھی ہے اور بھائی کا نمبر بھی فیڈ ہے۔ فون کر کے بات کر لیں اور واپسی کا بھی پوچھ لیں۔“

”مجھے ضرورت نہیں ہے۔ خود ہی آجائیں گے۔ آخر ساری رات تو باہر نہیں رہ سکتے۔“ وہ آگے بڑھنے لگی تھی۔ جب ملیجہ نے اُسکا بازو پکڑا۔۔۔

”بھابھی کیا میرا بھائی اتنا ہی بُرا انسان ہے؟ کہ آپ اُنکو مخاطب کرنا بھی پسند نہ کریں؟“

رباب کو اُمید نہیں تھی۔ کبھی وہ یوں جوابدہ ہوگی۔ اُسکی آنکھوں میں تری آگئی۔ جسے دیکھ کر خدیجہ نے ملیجہ کو فضول سوال و جواب کرنے پر ڈانٹ دیا۔ مگر رباب نے اُنکو منع کر دیا۔ ملیجہ کے قریب آئی اور اُسکے دونوں ہاتھ اپنی ہاتھوں میں لیکر ضبط رکھ کر بولی۔

”میں نے اپنی پوری زندگی میں میسم طلال سے زیادہ سلجھا اور نرم خوان انسان نہیں دیکھا۔ اُن میں ہر وہ اچھائی موجود ہے۔ جو ایک اچھے شوہر میں موجود ہونی چاہیے۔ اگر وہ مجھے اتنی رسوائی کے بغیر ملتے تو یقیناً مانو ز رباب خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی۔ مگر اب میرے دل پر جو زخم ہیں۔ وہ مجھے خوش ہونے نہیں دیتے۔ آپ نے کچھ کیا ہی نہ ہو۔ اور سب آپ کو غلط سمجھ کر نہ جانے کیا کچھ کہتے رہیں۔“

”ہم نے تو آپ کو ایک لمحے کو بھی غلط نہیں جانا۔ پلیز بھابھی دنیا والوں کی خاطر اُس شخص کا مزید دل نہ دکھائیں جو آپ کا سب سے بڑا خیر خواہ ہے۔ شب بخیر۔۔۔“ ملیجہ اُسکے گال پر پیار دیکر چلی گئی۔ وہاں اب بس رباب اور خدیجہ رہ گئے تھے۔ رباب آکر اُن کے قدموں کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔

”آئی کیا آپ بھی سمجھتی ہیں کہ میرا رویہ بچکانہ ہے؟“

خدیجہ نے مسکراتے ہوئے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر ٹھوڑی کے نیچے تین انگلیاں رکھ کر اُس کا چہرہ اوپر کیا۔ ”جانتی ہو جس دن تم اس گھر میں آئیں تھیں۔ مجھے بڑا غصہ تھا۔ جو حالت اُس دن میسم کی تھی۔ تو بہ تصور کر کے ہی دہل جاتی ہوں۔ مگر تمہارے ابو نے کہا۔ دیکھو خدیجہ تم ایسی عورت ہو جسے گلی میں کوئی بلی نہ کھتا زخمی یا بھوکا ملے تم گھر لے آتی ہو۔ اُنکا خیال کرتی ہو۔ کھانا دیتی ہو۔ اور جب وہ اس قابل ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ سے جا کر دنیا کا سامنا کر سکیں تو اُنکو جانے دیتی ہو۔ آج اس بچی کو بھی ایک زخمی اکیلی بلی کی طرح دیکھو اسکو بھی تمہارے مسیحا ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ جانوروں کے ساتھ بھلائی اگر افضل ہے۔ تو انسان کے ساتھ بھلائی افضل ترین ہے۔ پھر دوسری طرف میرا شہزادہ بیٹا تھا۔

مجھے میسم نے حیران کر دیا تھا۔ جس طرح نرمی سے وہ تمہارے ساتھ بات کرتا۔ تمہیں اپنے دوستوں سے ملوایا۔ کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ کہ یہ شادی زبردستی کروائی گئی ہے۔ فریقین کی مرضی سے نہیں ہوئی۔ مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے۔ اگر وہ چاہتا تو تمہیں طعنے مار مار کر جینا حرام کر دیتا۔ جن لڑکیوں کے پیچھے ماں باپ کی سپورٹ نہ ہو۔ کون اُنکو کچھ سمجھتا ہے۔ آج تو جن کے پیچھے یہ بھرے پڑے خاندان ہوں۔ شوہر نہ جانے کیسے کیسے کمینی فطرت کے مل جاتے ہیں۔ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔

بیٹی جو احساسات تمہارے ہیں۔ وہ یہ نوجوان نسل نہیں سمجھ پا رہی۔ انہوں نے آج تک کوئی مشکل وقت نہیں دیکھا ہے۔ اللہ نہ ہی ان پر کوئی ایسا وقت لائیں۔ جب انکے اپنے بھی آنکھیں پھیر جائیں۔ وہ وقت بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جس میں سے تم گزری ہو۔ بغیر کسی وجہ کے ایک چھوٹے سے حادثے نے سارا کچھ بدل کر رکھ دیا۔ تمہیں سنبھلنے میں وقت چاہیے تھا۔ اسی لیے میں نے تمہیں جانے دیا۔ پر بیٹی میں نہیں چاہتی ہوں۔ تم میسم سے طلاق لو۔ اگر مجھے اپنی ماں سمجھتی ہو۔ تو یہ میری خواہش سمجھ لو یا میرا حکم۔ وہ بھی یہ بات کہہ تو رہا ہے نا کہ تم ہریرہ کو چھوڑ دو وہ تمہیں چھوڑ دے گا۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ تمہارے جانے کے بعد اُس نے اپنا کمرہ چھوڑ دیا ہوا ہے۔ وہ اوپر نہیں رہتا۔ نیچے گیٹ روم میں رہتا ہے۔“

وہ خدیجہ کی باتوں پر حیران ہو رہی تھی۔ بے بسی سے بولی۔

”جب میں یہ بات سوچتی ہوں۔ ابوجی کو تو یہی لگا ہوگا کہ میرا ان کے ساتھ تعلق تھا۔ کسی نے مجھ سے صفائی نہیں مانگی۔ میری امی نے بھی نہیں۔ صرف اُس دن مجھے مخاطب کیا۔ جس دن انکے ساتھ میرا نکاح پڑھوایا۔ تب بھی ابوا انتہائی بے دردی سے بولے۔ اگر تم نے یہ نکاح نہیں کیا۔ میں تمہیں تو نہیں مگر خود کو ختم کر دوں گا۔ آنٹی میں کیسے اس رشتے کو زندہ رکھوں۔ میرا دل کٹتا ہے۔“

”تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر رہا۔ تمہارا جو بھی فیصلہ ہوا۔ میں تمہارا ہی ساتھ دوں گی۔ جیسے پہلے دیا تھا۔ پر بیٹی تم اپنے والی پوری کوشش تو کرو۔ دل کو سمجھاؤ۔ اب وہ صرف تمہارا شہر نہیں ہے۔ ہریرہ کا باپ بھی ہے۔ بچے کو تو ماں باپ دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُس کے لیے دونوں ہی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ دونوں ہی اہم ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بھی دونوں میں سے ایک کو قبول کر کے دوسرے کو راضی خوشی چھوڑ نہیں سکتا ہے۔“

وہ سر جھکائے بولی۔۔۔

”میں وعدہ نہیں کر سکتی۔ پر میں کوشش کروں گی۔ ہریرہ کہ خاطر میں کوشش کرنے کو تیار ہوں۔“

خدیجہ کے چہرے پر پُند سکون مُسکراہٹ دوڑ گئی۔

”یہ ہوئی ناں بات۔ چلو اب جا کر سو جاؤ کل بڑے کام ہیں۔ ہاں اُسکو فون کر دو گھر آ جائے۔ ہریرہ بھی تھکا ہوا ہے۔“

”جی اچھا۔۔۔“ اُس نے اپنے ہاتھ میں تھامے فون کو دیکھا۔

خدیجہ اپنے کمرے کے جانب بڑھ گئیں۔ تو وہ اوپر آ گئی۔ اوپر کے پورشن میں رنگ وغیرہ نیا کیا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

انڈور پلانٹس کے بڑے بڑے گملے باہر ہال میں پلرز کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ جن میں مختلف قسم کے پودے ہریالی لٹا رہے تھے۔ اُس کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ دل کی عجیب ہی حالت ہو رہی تھی۔ دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی آ گئے آئی۔ ہاتھ کے زور سے دروازہ پورا کھول دیا۔ کمرے میں سے جانی پہچانی ایر فریشز کی خوشبو نے استقبال کیا تھا۔ گہرا سانس اندر کھینچ کر آنکھیں موند لیں۔ دو چار سیکنڈ اسی طرح کھڑا رہنے کے بعد آگے بڑھ کر سوئچ بورڈ سے لائٹس آن کیں۔ اب جو کمرہ اُسکی نظروں کے سامنے تھا۔ اُس کی ہر چیز بدلی ہوئی تھی۔

کمرے کا تھیم نیلے رنگ کی بجائے براؤن اور گولڈن تھا۔ سارا فرنیچر بدلا جا چکا تھا۔

گہرے براؤن کارپٹ میں پاؤں گم ہو رہے تھے۔ اُس نے ڈریسنگ کے سٹول پر بیٹھ کر جوتے اتار دیئے۔ بالوں میں لگا کلپ کھول کر بالوں کا جوڑا بنا کر پونی سے لپیٹ دیا۔

ایک ایک کر کے اپنا اور ہریرہ کا بیک خالی کیا۔ سارا سامان نکال کر بیڈ پر رکھا۔ بیک تہہ لگا کر الماری کے نچلے خانے میں گھسائے۔ الماری کا مین پٹ کھولا تو دل میں درد اٹھا۔ کیونکہ سامنے شادی کے اول دنوں میں خریدے اور پہنے گئے تمام لباس بڑی ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ ان ظالم پلوں میں اُس پہ یہ انکشاف ضرور ہوا۔ یہاں سے جانے کے باوجود وہ یہی موجود تھی۔

اُس نے یہ گھر چھوڑا تھا۔ مگر اس گھر نے اُس کو نہیں چھوڑا۔ اندر ہی اندر دل کی زمین گیلی ہونے لگی۔ وہ زیادہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اُس کو علم تھا۔ دل دغا دینگا۔۔۔

اور وہ کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ میسم ابھی انا پر چوٹ پڑنے کی وجہ سے بھرا ہوا ہے۔ آخر ایک مرد کسی عورت کے پیچھے کب تک اکیلا رہ سکتا ہے۔ خود ہی ایک دن تنگ آ کر آگے بڑھ جائے گا۔ سارے نئے کپڑے اچھے سے تہہ لگا کر الماری میں رکھے۔ بیگلر پڑا لے والے بیگلرز پڑا لے ہریرہ کے ہمپرز وغیرہ ڈریسنگ کے نچلے دراز میں ڈالے۔ باقی اُسکے لوشن کریمیں سب ڈریسنگ کے اوپر رکھ کر اپنا کالا لینن کا سوٹ نکال کر لباس بدلا۔ وضو کیا۔۔۔ قبلہ رخ سے تو وہ پہلے ہی واقف تھی۔ وہیں کارپٹ پر جائے نماز بچھا کر اپنے رب کے حضور کھڑی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

”یار یہ یک تو کھا لیتا ہوگا؟“ قیصر نے تشویش سے پوچھا۔ فیصل نے جھٹ کہا۔

”دماغ تو نہیں چل گیا۔ بچے کے ابھی تک دانت بھی نہیں تم اُس کو یک کھلا لو۔“

”آئس کریم کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”اُس کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔۔۔“ قیصر اور میسم فیصل کو گھورنے لگے۔

”کینے تو بھی ہماری طرح چھڑا چھانٹ ہے پھر تجھے بچوں کے بارے میں اتنا کیسے علم ہے؟“ قیصر کی بات

پرفیصل نے یک کا بڑا سا چمچ منہ میں رکھا۔

”میری دودھ بڑی بہنیں شادی شدہ ہیں۔ دونوں کے بچوں کو کھلایا ہوا ہے۔ اس لیے مجھے اندازہ ہے۔ چھوٹے بچے کو کیسے دیکھتے ہیں۔“

”واہ یار پھر تو مجھے تم سے کلاسیں لینی چاہیے ہیں۔“ فیصل نے میسم کو آفر کی۔۔۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ تم ایک کلاس کے دس ہزار دے دیا کرنا۔ میں تمہیں ہفتے کی چار کلاسیں دوں گا۔“

”بس کردی نہ دو نمبر بیو پارٹی والی بات۔ جس کے پاس اول تو کوئی گا ہک آتا نہیں ہے۔ اور اگر کبھی بھولے سے کوئی مرغا ہاتھ لگ جائے تو اُنکے ریٹ ایک دم شوٹ کر جاتے ہیں۔“

”چھوڑ یار میسی کس کو شرم دلوار ہے ہو۔ ویسے یار ہریرہ ہے تو بیبا بچہ کتنی دیر ہو گئی تمہاری گود میں آرام سے بیٹھا ہوا ہے۔ ورنہ اتنے چھوٹے بچے تو اکثر روتے ہی رہتے ہیں۔“

فیصل جلدی سے بولا۔ ”یہ ایک صابر باپ کا صابر بچہ ہے۔ اس کا باپ بھی نہیں روتا۔ یہ بھ۔۔۔“ میسم نے اُسکو درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”بس میری عزت افزائی بہت ہو گئی۔ اب ذرا اصل موضوع پر بات ہو جائے۔ پرسوں ملی کی مگنی ہے۔ تم لوگوں کو دوسروں کی طرح باقاعدہ کارڈز بھیجنے پڑیں گے یا آ جاؤ گے؟“

”نہیں یار تم نے بتا دیا ہے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ ویسے بھی اپنی تو گھر والی بات ہے۔ بلکہ ہمارے لائق کوئی بھی خدمت ہو ضرور بتانا۔“

”ہاں بس کوشش کرنا آنے سے پہلے منہ اچھی طرح دھو آؤ۔“ میسم نے ہریرہ کے ہاتھ میں ایک سسٹ تھمایا اور پریشانی سے اپنے دوستوں کو دیکھا۔

”یار اسکو جو بھی کھانے کی چیز دیتا ہوں۔ یہ کھانے کی بجائے اُسکے ساتھ کھیلنے لگتا ہے۔“ میسم کے تاثرات دیکھ کر دونوں کو ہنسی آ گئی۔

”بھائی بچہ شکل و صورت میں باپ پر گیا ہے۔ تو حرکتیں بھی تو باپ جیسی ہی کرے گا ناں۔ پر فکر نہ کرو۔ بڑے وقت پر ہی اپنی شاگردی میں آ گیا ہے۔ ہم اپنے شیر کو سب سیکھا دیں گے۔“ فیصل نے ہریرہ کو گود

میں لیا۔ وہ ہنستے ہوئے فیصل کا چہرہ دیکھنے لگا۔ جبکہ قیصر بولا۔

”تمہاری شاگردی میں تو وہ بس کھانا ہی سیکھے گا۔ ایک لڑکی کا نمبر تک تو تم مانگ نہیں سکتے۔“ اس بات پر ہریرہ رونے لگا۔ فیصل اُسکو بہلاتے ہوئے بولا۔

”دیکھ لیا تمہارا جھوٹ اتنے سے بچے نے بھی فٹ پکڑ لیا ہے۔ ہریرہ یا تم صحیح وقت پر آئے ہو۔ تمہاری سحرش آنٹی نے بے وفائی کی ہے۔ یارا اُسکی منگنی ہو گئی ہے۔ اب دیکھنا ہم اُسکے میاں سمیت اسکو ملی پھوپھو کی منگنی پر انوائیٹ کریں گے۔ تمہارا چچا اُس دن بیوٹی پارلر سے تیار ہوگا۔ تب اُس ظالم کو احساس ہوگا۔ ایک گلغام کو چھوڑ کر وہ پیسے والے لنگور کے ساتھ چلی گئی ہے۔ اب بھلا کنگلا گلغام اور رئیس لنگور برابر تھوڑی ہیں۔ یا تم بھی جلدی سے بڑے ہو جاؤ تمہارے ماں باپ تو بچوں جیسے رویے رکھتے ہیں۔“

”میں اب چلتا ہوں۔ ہریرہ کو نیند آرہی ہوگی۔ سوا بارہ ہو گئے ہیں۔ یہ اس وقت پاکستان کا واحد چار ماہ کا بچہ ہوگا۔ جو جاگ رہا ہے۔ امی بتا رہی تھیں۔ یہ رات کو پیدا ہوا تھا اور جو بچے رات کو پیدا ہوتے ہیں وہ رات کو زیادہ جاگتے اور دن میں سوتے ہیں۔“

”یہ بھی عجیب سائنس ہے۔“ میسم کے اٹھتے ہی دوسرے دونوں بھی اٹھ گئے۔ بل پے کر کے کافی شاپ سے نکل کر پارکنگ لاٹ کی طرف جاتے ہوئے وہ بولا۔

”یارا اپنی طرف سے پُرانے گروپ میں سے جس کو چاہو انوائٹ کر لینا میں کل بلال کو کہہ کر خالی کارڈز تم دونوں کی طرف بھجوا دوں گا۔“

”کہا تو ہے۔ کارڈز کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ویسے بھی اچھا کھانا کم ہی چھوڑتے ہیں۔ بے فکر رہو۔ ساری پلٹون حاضر ہوگی۔“

ڈرائیور انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُسکے پچھلی سیٹ سنبھالتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ جونہی گاڑی گیٹ سے اندر آئی۔ اُسکی نظر اوپر اپنے کمرے کی بالکونی پر پڑی۔ جہاں کھلے دروازے میں سے لائٹ جلتی نظر آرہی تھی۔

”چلو ہریرہ تمہارے آنے سے تاریک پڑا آگن آباد تو ہوا۔۔۔“

ہریرہ اُسکے سینے پہ سر رکھے مزے سے سو رہا تھا۔ اُس نے اپنا لمبا سا بازو اُسکے گرد لپیٹ کر ہاتھ سر کی بیک پر

رکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کتنی دفعہ اُسکی پیشانی پہ بوسے دے چکا تھا۔ پھر بھی ہر دفعہ سر جھکا کر ہریہ کا چہرہ دیکھتا۔ بے اختیار اپنے لب اُسکے چہرے پہ رکھ دیتا۔

گیسٹ روم کے باہر کو کھلنے والے دروازے سے باہر کالا کھول کر اندر آیا۔ جب بھی وہ گھر دیر سے آتا۔ کسی کو اٹھ کر اُسکے لیے دروازہ نہ کھولنا پڑے۔ اسی کو مد نظر رکھ کر اس دروازے کی چابی ہمیشہ اُسکے پاس ہوتی تھی۔ خدیجہ وغیرہ بھی اس بات کا خیال رکھتے تھے۔ دروازہ میں اندر کی جانب چابی نہ رہ جائے۔ اُس صورت میں اُسکو مین بڑا دروازہ ہی کھٹکھٹانا پڑتا۔ اندر آ کر اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا وہ گیسٹ روم سے نکل کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

اوپر آتے ہی کانوں سے جو آواز نکرائی وہ ٹی وی کی تھی۔ آج وہ پورے گیارہ ماہ بعد اپنے کمرے کا رخ کر رہا تھا۔ اسکو امی نے اتنا کہا کم از کم اوپر ایک دفعہ جا کرنی سینگ ہی دیکھ آؤ۔ مگر اُس نے کوئی شوق ظاہر نہ کیا۔ حقیقت میں اُسے کوئی سروکار نہ رہا تھا۔ اُسکی بلا سے چاہے کمرے کو سارا کالا ہی رنگ کیوں نہ کر دیتے۔

اندر آتے ہی نظروں نے اُسے فوکس کیا۔ جو کالے جوڑے پر سفید دوپٹے کی بٹل مارے بیڑ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ میسم کا جی چاہا اُسکے چہرے پہ رقم سارا سکون نوچ ڈالے۔ زباب اُسکو اندر آتے دیکھ کر ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اُسکی جانب بڑھی۔

بڑی احتیاط کے ساتھ میسم سے ہریہ کو لے لیا۔ اس عمل کے دوران اُس نے میسم سے نظر نہیں ملائی۔ نہ ہی براہ راست اُسکے چہرے کو دیکھا۔ دیکھ لیتی تو کم از کم یہ ہی جان پاتی اُسکی آنکھوں سے کس قدر شعلے نکل رہے تھے۔ وہ پہلے سے ہی ہریہ کے کپڑے نکال کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسکو بیڈ پر اپنے آگے لٹانے کے بعد خود اُسکے پیروں کے قریب بیٹھ گئی۔

پہلے اُسکے جوتے اتارے۔ پھر جرابیں، اسی طرح ٹراؤزر اُسکے بعد شرٹ، سویٹر صرف نیچے ڈالی گئی ہائی نیک رہنے دی۔ پیجر بدلنے کے بعد ملل کا شلوار سوٹ پہنایا۔۔۔ نئی گھلی سی جرابیں ڈالیں۔۔۔

اُس کے اوپر کمبل ڈال کر ساری چیزیں سیٹتے ہوئے اپنے خیال میں اٹھی اور سامنے دیوار بن کر کھڑے میسم سے کرا گئی۔

”سوری مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ میں سمجھی آپ واپس نیچے جا چکے ہونگے۔۔۔“

میسم دھیرے سے ہنسا۔ انداز خود اپنا مذاق اڑانے والا تھا۔ ”تم سمجھیں میں نیچے چلا گیا ہوں یا تم چاہتی ہو میں نیچے چلا جاؤں۔“

وہ اسکی آنکھوں میں دیکھنے کی غلطی کر گئی۔ جو کہنے جا رہی تھی۔ بات بھول گئی۔ میسم کی نگاہوں میں زباب کو اپنے عکس کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔

”وہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ یہ کپڑے رکھنے جا رہی تھی۔ ہاتھ دھو کر ہریرہ کو فیڈر دینا ہے۔“

”میں نے تو تم سے کچھ نہیں پوچھا۔ مجھے کیوں بتا رہی ہو۔“ وہ ایک طرف ہو کر لائق سے بولا۔ زباب اثبات میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ گال سرخ ہو گئے۔ لب بھینچے اُس نے ہریرہ کے اتارے ہوئے کپڑے ڈریسنگ کے پاس پڑی ٹوکری میں رکھے۔ واش روم سے جا کر صابن سے ہاتھ دھو آئی۔

ہریرہ کا فیڈر بنا کر اُس نے کور میں رکھا تھا تا کہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔ ابھی کمرے میں موجود میز پر رکھا فیڈر اٹھا کر کور ہٹایا اور بیڈ پر بیٹھ کر پہلے ہریرہ کو گود میں لیا۔ پھر اچھے سے فیڈر ہلا کر اُسکو پلانے لگی۔ اس دوران میسم واش روم سے ہو کر آیا۔ ٹی وی ریموٹ ہاتھ میں لیکر بیڈ پر جوتوں سمیت ہیڈ بورڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جما کر ایک ہاتھ سر کے پیچھے رکھے بظاہر وہ چینل سرفنگ کر رہا تھا۔ مگر نظریں اُس آئینے سے ڈھکے سر پہ تھیں۔ جو پوری توجہ سے ہریرہ کو فیڈ کر رہی تھی۔ وہ بار بار سو جاتا۔ وہ بار بار اُسکو ہلا کر متوجہ کرتی۔ کبھی اُسکے چہرے پر ہلکی سی پھونک مارتی جس سے ہریرہ گہری نیند سے ذرا بیدار ہو کر پوری دل جمعی سے دودھ پینے لگتا۔ یہ وہ گیم تھی۔ جو دونوں ماں بیٹا دن میں کئی مرتبہ کھیلتے۔ کیونکہ جب ہریرہ سوتا تھا تو گھوڑے گدھے بچ کر سوتا۔ وہ اپنے آپ پر اختیار نہ رکھ پایا۔ اٹھ کر بیٹھا۔ ہاتھ بڑھا کر زباب کے گرد لپٹے دوپٹے کی گرہ دھیرے سے کھول کر دوپٹہ ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔

ایک سرد لہر زباب کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی محسوس ہوئی۔۔۔۔۔

”میری اس جسارت پر برداشت منانا۔ اس وقت تم صرف اور صرف ہریرہ کی ماں لگ رہی ہو۔ اور مجھے اپنی زباب کی تلاش ہے۔“

اُس نے پونی نکال کر اُسکے بال بکھیر دیئے۔ خود ایک دفعہ اپنی پہلی حالت میں چلا گیا۔ گھنے سلکی بالوں کو اجازت ملنے کی دیر تھی۔ کسی آبشار کی طرح اُسکے چہرے کے گرد گرے۔ زباب نے دونوں آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ کھولیں تو اُن میں نمی تھی۔ ایک بار توجہی چاہا ہریہ کو لٹا کر اپنے اس دیوانے شوہر کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لے۔ بے شک اُس نے اسکا دل ڈکھا کر گناہ کیا تھا۔ مگر بے بسی اس قدر تھی۔ کوئی اور راہ بھی تو نہ تھا۔ وہ خود سے ہی لڑ رہی تھی۔ جب میسم کا سوال آیا۔

”جب ہریہ ہوا تھا۔ تب تمہارے پاس کون تھا؟“ زباب اُن پلوں کو یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بھولنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

”آئی اور خالہ۔۔۔“

”آئی کون۔۔۔؟“

”آئی امی۔۔۔“ دوبارہ سے پھر دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ وہ چینل بدلتا دو تین منٹ بے خیالی میں سکرین کو دیکھتا۔ پھر اگلا چینل لگ جاتا۔ ہریہ کو بیڈ پر لٹا کر اچھے سے کبل دینے کے بعد اُٹھ رہی تھی۔ کہ حکم موصول ہوا۔

”میرے جوتے اتار دو۔۔۔“

اُس نے چونک کر گردن موڑی۔ آیا یہ الفاظ میسم کے ہی ہیں۔ اُس نے ٹی وہ سکرین سے نظر ہٹا کر بھنویں اچکا کر اُسکو دیکھا۔

”کیا سنائی نہیں دیا؟“ زباب نے کچھ نہیں کہا۔ اُٹھ کر اُسکے جوتے اتار دیئے۔ ساتھ ہی جرابیں بھی کھینچ کر لائڈری والی ٹوکری میں پھینک دیں۔

”اور کچھ۔۔۔؟“ وہ پوچھ کم اور گھور زیادہ رہی تھی۔

”ادھر الماری میں اگر کوئی سلپنگ سوٹ ہے تو نکال دو۔ ورنہ نیچے سے لیکر آؤ۔۔۔“ اُس نے غور سے اُس آدمی کو دیکھا۔ جو اپنے ذاتی کام کے لیے ماں یا بہن کو بھی تکلیف نہیں دیتا تھا۔ وہ اگر پہلی دفعہ اُسکے ساتھ اس طرح سے موجود ہوتی تو حیران نہ ہوتی۔ مگر وہ ماضی میں اس آدمی کے ساتھ پورے چالیس دن گزار چکی

تھی۔ وہ ایسا انسان تھا۔ اگر رات کو پیاس لگتی تب بھی خود جا کر پانی پی کر آتا۔ کسی دوسرے کو حکم دینا اسکی فطرت میں شامل نہیں تھا مگر اس وقت وہ ایسا کر رہا تھا۔

رُباب اُسکے کپڑے پہلے ہی وہاں پڑے دیکھ چکی تھی۔ گرے اور سفید چپک والا کاٹن کا ٹراؤزر ساتھ میں سادی سفید ٹی شرٹ نکال کر واش روم میں رکھ آئی۔

اب وہ اُسکو دیکھ رہی تھی۔ یہ اُٹھ کر واش روم میں جائے تو وہ سونے کے لیے لیٹے۔ مگر وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی توجہ اور فرصت سے ٹی وی سکرین پر تھرکتے وجود دیکھنے میں مصروف تھا۔

سنی لیونی اپنی دیسی لُک کا جلوہ ہر ادا سے دیکھا رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی جان بوجھ کر انجان بنا بیٹھا ہے تاکہ رُباب خود سے مخاطب کرے۔ پورے پانچ منٹ اسی ڈرامے میں گزرنے کے بعد ناچار اُسکو بولنا پڑا۔

”میں نے آپ کے کپڑے واش روم میں رکھ دئے ہیں۔ اُٹھ کر بدل لیں۔“

کوئی ردِ عمل ہی نہیں۔۔۔

اب رُباب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ سنی لیونی گئی تھی اور دھپکا جھٹکے پھٹکے کھاتے ہوئے یہ اعلان کر رہی تھی۔ وئے میں کملی ہو گئی آ نام تیرا پڑھ کے۔۔۔ آخر اُس نے مزید کہنے سننے کا ارادہ ترک کیا۔ ہر یہ کا ڈبل کبل لیا۔ صوفے پر لیٹ کر سر تک کبل اوڑھ لیا۔ ابھی دو سیکنڈ ہی گزرے ہوئے جب کبل کھینچا گیا۔

”تمہاری اس بچکانہ حرکت کا کیا مطلب لوں؟“ زباب سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بے بسی سے بولی۔

”میں نے کوئی حرکت نہیں کی ہے۔ بس سونا چاہ رہی ہوں۔“

”صوفے پر سونے کی تمہاری بڑی پرانی خواہش رہی ہے مگر تمہاری بد قسمتی کہ مجھے یہ حرکت انتہائی چپ لگتی ہے۔ لوگ بظاہر شادی خندہ ہوں۔ اولاد پیدا کر کے پھر ایک دوسرے سے بھاگتے پھریں۔ بیگم جی اگر کوئی اتنا ہی نازک مزاج ہو۔ تو پھر اُس انسان کو چاہیے کہ وہ مرنے پر اوکھلی میں سر نہ دئے۔ اور اگر دے لے تو پھر مردوں کی طرح سر اٹھا کر زندگی گزارے۔“

”جا کر بیڈ پہ سو جاؤ یقین مانو میرے دل میں تمہارے قُرب کی تمام چاہت اپنی موت مر چکی ہے۔“

تمہارے ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خواہ تم میری توجہ حاصل کرنے کو یہ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہی ہو۔“ زباب کو لگا شاید یہ اسکی سماعت کا دھوکا ہو۔ مگر نہیں یہ سب باتیں میسم نے ہی کی تھیں۔

اپنی بات کرنے کے بعد اُس نے اپنی کلائی سے گھڑی کھول کر بیڈ سائیڈ دراز پر رکھی، ساتھ ہی جیب میں سے والٹ اور موبائل نکال کر رکھا۔۔۔۔۔ کف کھولتا ہوا۔ الماری کی جانب گیا۔ گرتا اتار کر ہینگر پر ڈالنے کے بعد واش روم میں بند ہو گیا۔ زباب نے ہر سوچ، دماغ سے جھٹکی، لائٹ ڈم کی اور آ کر ہریہ کے برابر لیٹ گئی۔ وہ اس وقت ذہنی و جسمانی طور پر تھکی ہوئی تھی۔ ابھی ہریہ نے ایک دفعہ اسکو چار پانچ بجے پھر اٹھانا تھا۔ اُس سے پہلے وہ نیند لینا چاہتی تھی۔

اس دفعہ کمرے میں جو شور جاگا وہ میسم کے موبائل کا تھا۔

زباب نے سر کمبل کے اندر کیا اور ڈھیٹ بنی پڑی رہی۔ ایک دفعہ بیل ہو کر بند ہو گئی۔ دوسری دفعہ جاری ہوئی تو وہ واش روم سے نکل آیا تھا۔ فون کی سکرین پر نظر پڑتے ہی اُسکے لب مسکرا اٹھے۔ وہ اس نمبر سے پچھلے ایک ہفتے سے کال موصول کر رہا تھا۔ مگر اٹھائی نہیں۔ پر اس وقت یہ کال اُسکو کوئی غیبی مدد لگی۔

”ہیلو سوئٹ ہارٹ کیسی ہو؟“ کمبل کے اندر زباب کی دونوں آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ کانوں میں اگر زوم ان ہونے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے تو وہ سو فیصد زوم ان کر گئے تھے۔ دل کی دھڑکن شوٹ کر گئی۔ آخر کس کو اس پیار سے مخاطب کیا ہے؟

”ارے نہیں یار اب میں اتنا بھی بد ذوق انسان نہیں ہوں۔ رات کی ان حسین گھڑیوں میں تمہارے جیسی خُسن کی دیوی سے بات ہونا تو اپنی جگہ ایک معنی رکھتا ہے۔“

”سوری یار آج میں ذرا آن لائن نہیں آسکا۔ اصل میں ایک تو میرا بیٹا آیا ہوا ہے۔ دوسرا آج میری سسٹر کے سُسرال والے کچھ معاملات طے کرنے آئے ہوئے تھے۔ اُسکے بعد اپنے دوستوں کے ساتھ نکل گیا۔“

”نہیں کل آفس شائد ہی آپاؤں گا۔۔۔ تم ایسا کرو۔ پرسوں شام میرے گھر پہ فنکشن ہے۔ وائے ڈونٹ فو جوائن می فار دایوننگ۔۔۔ ہم کام کی ٹرمز پر بھی بات کر لیں گے کیونکہ مجھے نہیں لگتا اگلے آنے والے کچھ دن میں آفس کا چکر لگا سکوں گا۔“

نہ جانے دوسری طرف سے کیا کہا گیا جس پر وہ دلکش قہقہہ مار کر بولا۔

”ایمان میری فیملی میرے حوالے سے بہت آزاد خیال ہے۔ وہ یقیناً تمہاری ہمارے ہاں آمد کو بہت پسند کریں گے۔“

”ارے یار تم تو جو بھی پہن لو اپرا ہی لگو گی۔ مگر بس ایک چیز کا خیال رکھنا۔ ساڑھی سے مجھے عجیب سی نفرت ہے۔ بس ساڑھی چھوڑ کر کچھ بھی پہنو گی۔ قیامت ہی ڈھا ڈگی۔ میں تمہیں اپنے گھر کا ایڈریس ایس ایم ایس کر دوں گا یا اگر چاہو گی تو خود پک اینڈ ڈراپ دے دوں گا۔“

دوسری جانب چانس کی متلاشی ایمان کو یقین ہی نہ آ پارہا تھا کہ فون پر یہ وہی میسم ہے جس کے آفس کے وہ کتنے چکر لگا چکی تھی۔ وہ سیدھے منہ بولنا تو دور کی بات ہے نظر اٹھا کر ایک نظر دیکھتا تک نہ تھا۔ وہ فون کر کر کے کھپ چکی تھی۔ مگر وہ کبھی فون اٹھاتا ہی نہ تھا۔ فیس بک پر بھی میسج دیکھ لیتا پر جواب دینے کی زحمت کبھی بھی گورا نہیں کی۔ آج اُس نے ایویں سونے سے پہلے عادت کے مطابق نمبر ملا یا پر آج میسم طلال کسی اور ہی موڈ میں تھا۔ وہ سیٹی پر شوخ سی ذہن بجاتا ہوا۔ آکر اُس کے برابر میں لیٹ گیا۔ نیم اندھیرے کمرے میں پوری آنکھیں کھول کر دیکھتے ہوئے بھی وہ یوں بن گئی جیسے سو گئی ہو۔ ٹی وی بند ہونے کے بعد زباب کو جب اُس کے سو جانے کا یقین ہو گیا تو سر کبل سے باہر نکلا مگر غلطی ہی کی کیونکہ عین اُسکے چہرے کے قریب سر رکھے اُسکی طرف دیکھ کر بڑی کمینگی سے مسکرایا۔

”تمہیں یقیناً اس وقت بھی لوگوں کی فکر سونے نہیں دے رہی۔ آخر لوگ کیا کہیں گے۔ ویسے تو شوہر کے خلاف خلع کا کیس دائر کیا ہوا ہے اور اب اُسی کے پہلو میں سو رہی ہے۔“

زباب کی جی چاہا ہر لحاظ بلائے طاق رکھ کر اُس کو پوچھے ابھی فون پر کون تھی؟ کس کو سوٹ ہارٹ کہہ رہے تھے؟ کون ہے جو تمہیں ہر روپ میں اپرا لگتی ہے؟ پھر ایک دم سوچ کا بے لگام گھوڑا اٹھم گیا۔ کیونکہ وہ اس پوائنٹ پر ششدر رہ گئی۔ کیا میں کبل کے اندر سے میسم کی ساری باتیں اس قدر غور سے سن رہی تھی کہ لفظ بہ لفظ ازبرہ گیا؟۔۔ اس ایک سوال نے اُسکو انتہائی بے چین کر دیا۔ جب میں اُنکے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی۔ پچھلے ایک سال سے ہمارے درمیان کچھ ہے ہی نہیں تو میری بلا سے جسکو مرضی جو مرضی بولیں۔ سوٹ ہارٹ یا

ڈارلنگ۔۔۔ مجھے کیا۔ مگر ہزار دفعہ سمجھانے پر بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور رہی۔ میسم بھی اُسکی جانب سے کروٹ بدلے ساکت پڑا ہوا تھا۔ اب اللہ جانے سو گیا تھا۔ یا اسکی طرح وہ بھی جاگ ہی رہا تھا۔ آنکھ لگی ہی ہوگی۔ جب ہریہ کے رونے کی آواز کے ساتھ کمرے میں سیٹی کی آواز گونجی۔ رُباب کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ہریہ اتنا شرارتی بچہ ہوگا۔ روتا روتا سیٹی کی آواز پر ہنسنے لگ گیا۔

ساتھ ہی میسم کا قہقہہ گونجا۔۔۔

ہریہ پھر سے رویا۔۔۔۔۔ سیٹی بجی ساتھ ہی ہنسنے لگا۔ یہ گیم اُس وقت چلتا رہا۔ جب تک رُباب نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ہریہ کی پیٹی نہیں بدلی پھر لائٹ بند کر کے اُسکو گود میں لیکر فیڈ کروانے لگی۔ میسم کی جانب پشت تھی۔ سر پہ دوپٹہ رکھے اپنے دھیان میں بیٹھی تھی جب میسم نے ایک دفعہ پھر سیٹی بجائی۔ ہریہ صاحب دودھ پینا چھوڑ کر کھی کھی کرنا شروع ہو گئے اور ہنس بھی وہ ایسے رہا تھا۔ جیسے باقاعدہ طور پر کسی نے گد گدی کی ہو۔ خاموشی ہوئی۔ ہریہ پیٹ پوجا کرنے میں مصروف ہوا۔ سیٹی گونجی دوبارہ وہی ڈرامہ ہوا۔ جب چوتھی دفعہ یہی عمل ڈہرایا گیا تو رُباب کی کڑک دار آواز اُٹھی۔

”میسم اگر اب آپ نے سیٹی بجائی تو اللہ کی قسم میں ہریہ کو لیکر نیچے چلی کے کمرے میں چلی جاؤں گی۔“
اندھیرے میں میسم کی مسکراتی ہوئی آواز آئی۔

”مجھے کیوں آنکھیں دیکھا رہی ہو۔ اپنے بیٹے کو ڈانٹو۔ میں نے آخر کیا ہی کیا ہے؟“
ایک اور سیٹی۔۔۔۔۔ ہریہ کے قہقہے۔۔۔۔۔ وہ پہلے ہی اتنی مشکل سے نیند بھگا کر اُٹھی تھی۔ غصے سے ہریہ کو میسم کے برابر بیڈ پر لٹا کر اُٹھنے لگی۔

”آپ دونوں اپنی مستیاں جاری رکھیں۔ میں یہاں سے جاتی ہوں۔“
میسم نے جلدی سے اُسکا بازو پکڑ کر روکا۔

”اچھا یا راب نہیں کرتا۔ سوری۔۔۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔۔۔“

وہ سنجیدہ ہو کر کروٹ کے بل لیٹ گیا۔ دو تین منٹ انتظار کرنے کے بعد رُباب نے ہریہ کو دوبارہ فیڈ کروانا شروع کیا۔ جب تک وہ سویا۔ باہر مساجد میں فجر کی اذان ہو گئی تھی۔ بچے کو اچھی طرح کھیل اوڑھانے

سب سے پہلے وہ گاڑی سے باہر آئی۔ ہاتھ لگا کر دوسری گاڑی کی بیک سکرین پر لکھے الفاظ کو محسوس کیا۔ ہاتھ میں کپکپاہٹ آگئی۔ اُسکا جی چاہا پر لگ جائیں اور وہ اڑتی ہوئی اندر پہنچ کر دیکھے کہ گاڑی پر کون آیا ہے۔ مگر قدم یوں من من کے بھاری ہو گئے۔ ملیجہ اُسکو دیکھ کر تشویش سے بولی۔

”امی مجھے لگتا ہے بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دیکھیں تو رنگ کیسے لٹھے کی طرح ہو رہا ہے۔“

خدیجہ اُسکی جانب بڑھیں جو اپنا ہینڈ بیگ بھی گاڑی میں ہی چھوڑ کر اندر کی جانب جا رہی تھی۔

”راہی۔۔؟ کیا ہوا؟“ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ اُنکا کندھے پہ دھرا ہاتھ جھٹکا اور آگے بڑھ گئی۔ ہال کے دروازے کے پاس تھی۔ جب اندر سے میسم کے قہقہوں کا ساتھ کسی اور کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔

”بھائی صاحب صبح سے یہ دونوں باپ بیٹا مجھے یونہی مصروف کئے ہوئے ہیں۔ اب اچھا ہوا آپ بھی آگئے۔ دیکھ لیں انکے تماشے۔۔۔“

ہال کے دروازے سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ڈبل صوفے پر طلال احمد کے برابر بیٹھے شخص کو دیکھ کر اُسکو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ساری کائنات اپنے مدار میں تھمتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اگر پیچھے سے ملیجہ نہ تھام لیتی تو شاید پورے قد سے گرتی۔ سامنے موجود ہستی کوئی اور نہیں زباب کے ابو تھے۔ ملک عالم حیات۔۔۔۔۔

ملیجہ کا ہاتھ تھامے ہی وہ قدم قدم چلتی اندر آئی۔ تبھی اُن کی نظر پڑی۔ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔ وہی روشن چمکتا سرخ و سفید چہرہ کنپٹیوں پر سفید تاریں۔۔۔ کریم کرٹڈی کے شلوار سوٹ پر سکن رنگ کا بنبنیزا کا سوٹر کندھے پر کریم گرم چادر۔۔۔

میسم نے اُنکی گود سے ہریہ کولیا۔ زباب اُنکے سینے سے لگی تو یوں لگا زندگی کے تپتے صحرا میں ٹھنڈی چھاؤں میسر آ گئی ہو۔ اُسکو اپنے اوپر کوئی اختیار نہ رہا تھا۔ زندگی نے سب کچھ دیا تھا۔ محبت کرنے والا شوہر اتنی چاہت کرنے والی سُسرال اتنا پیارا صحت مند بیٹا۔ کسی کے پاس یہ سب کچھ ہو تو کوئی پاگل ہی ناخوش رہے گا۔ مگر زباب اب تک نہ خوش ہی تھی۔ کیونکہ اُسکے پاس سب کچھ تھا۔ مگر باپ کا شفقت بھرا لمس نہیں تھا۔ اُس کے پاس یہ یقین نہیں تھا کہ آیا وہ ماں باپ کے منہ سے نکلنے والی ڈعاؤں میں حصہ دار ہے یا نہیں۔ وہ اپنے باپ کی دہلیز سے جب نکلی تھی۔ تب وہ اُن سے ناراض ہو کر آگئی تھی اور وہ اس سارے وقت میں زندگی سے بھی صرف

اسی لئے ناراض رہی کیونکہ ماں باپ سے ناراض تھی۔ آج ابو کے سینے پر سر رکھ کر معلوم ہوا۔ اس محبت کی کمی تھی اور یہ کمی ہر خوشی پر بھاری تھی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ عالم حیات نے بڑے پیار سے اُسکو ساتھ لگایا ہوا تھا۔ اُس کے سفید سندھی کڑھائی والی چادر سے ڈھکے سر پر ایک ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دے رہے تھے۔

”اب بس بھی کرو یا رکیوں ابو کو پریشان کر رہی ہو۔ ہریرہ کی شکل بھی رونے والی ہو رہی ہے۔“

میمم کی آواز پر وہ چونکی۔ سر اٹھایا۔ پلو سے چہرہ صاف کیا۔ ایک شرمندہ سی نظر اپنے گرد ڈالی۔ سب ہی کھڑے تھے۔ لپٹی بولی۔۔

”آپ تعارف کروا رہی ہیں یا مجھے گیس کرنا پڑے گا؟“ وہ مسکراتے ہوئے ایک طرف ہوئی۔

”یہ میرے ابو جی ہیں۔“ خدیجہ تو بسم اللہ کر کے آگے آئیں۔

”میں صدقے جاؤں آج تو میرا بھائی اپنی بہن کے گھر آیا ہے۔ کب کے آئے ہیں۔ طلال آپ ہم لوگوں کو فون کر دیتے۔ بھائی صاحب کی کوئی خدمت بھی کی یا دیے ہی بھوکا پیاسا بٹھایا ہوا ہے۔“

ملک عالم حیات کے اندر تک سکون کی لہر دوڑ گئی۔ خدیجہ کی باتوں سے اُنکو یقین ہو گیا۔ اُن کی بیٹی اچھے قدر دان لوگوں میں تھی۔ طلال کہ بجائے میسم نے جواب دیا۔

”امی میں نے لٹچ باہر سے ہی منگو لیا تھا۔ اب پتا نہیں ابو کو پسند آیا کہ نہیں۔ البتہ ابھی چائے کا ٹائم ہے۔ آپ جو کر سکتی ہیں کر لیں۔“

ملیجہ لپٹی نے سلام ڈال کر اپنے کمرے میں سامان رکھنے چلی گئیں۔ خدیجہ کچن کو آئیں۔ زباب کو دیکھتے ہی ہریرہ نے شور مچا دیا تھا۔ جس پر اُس نے اُسکو میسم کی گود سے لے لیا۔

”بڑے بے وفا ہو یا۔۔۔ صبح سے مجھے اپنا مداری بنایا ہوا تھا۔ اب ماں کو دیکھتے ہی اُس کے ہو گئے ہو۔“

اُس کی بات پر سبھی مسکرائے۔ عالم حیات نے غور سے اپنے پاس بیٹھی بیٹی کا جائزہ لیا۔ جس کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔

”امی کا کیا حال ہے؟ عہد اللہ کو بھی ساتھ لے آتے۔۔۔“

”جس دن کا میسم گھر پہ ہریرہ کا بتا کر آیا ہے۔ تمہاری ماں کو بس دن رات ایک ہی بات آتی ہے۔ جاکر

دونوں کو لیکر آؤ۔۔۔ میں کام میں تھوڑا مصروف رہا۔ کچھ وہ تمہارے کپڑے بنا رہی تھی۔ آج میرے پاس وقت تھا۔ میں نے کہا چلو آج ہریرہ کو اُسکی نانی کی طرف سے بنائے تحفے دئے ہی آؤں۔“ سب کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میسم ناروال کب گیا۔

”تحفوں کی کیا ضرورت تھی۔ بھائی صاحب آپ آگئے ہیں۔ ہمارے لیے تو یہی سب سے بڑا تحفہ ہے۔“ خدیجہ کچن میں رکھی مٹھائی اور فروٹ کی ٹوکریاں دیکھ کر حیران پریشان ہو گئی تھیں۔ اتنی زیادہ مٹھائی اور فروٹ۔۔۔۔۔ اُسکے علاوہ دو بڑے بیک باہر ہال میں رکھے ہوئے تھے۔ جس میں یقیناً کپڑے وغیرہ تھے۔ خدیجہ نے چائے پر اچھا خاصہ اہتمام کیا۔ زباب کا تودل کر رہا تھا۔ بس ابو کے سامنے بیٹھ کر اُنکا خوبصورت چہرہ دیکھتی رہے۔ آج وہ اتنے عرصے بعد پہلی دفعہ خوش تھی۔

چائے کے بعد عالم حیات نے اجازت طلب کی۔۔۔

”میں تو تم دونوں ماں بیٹے کو ساتھ لیکر جانے کی نیت سے آیا تھا۔ مگر اب میجہ بیٹی کی منگنی دیکھ لو۔ اُسکے بعد عبداللہ کو بھیجوں گا۔“

”ایسا کریں آج آپ ادھر ہی زکیں۔ گھر پر عبداللہ کو فون کریں۔ امی کو لیکر آجائے۔“ میسم کے مشورے پر وہ مسکرائے۔

”نہیں یار عبداللہ آج ٹرپ کے ساتھ مری گیا ہوا ہے۔ تمہاری ماں بھی گھر پر اکیلی ہے۔ اسلیے آج جانے دو۔ اگلی دفعہ آیا تو زکوں گا۔“

رباب کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ابو واپس جائیں۔ سبھی اُنکو باہر تک چھوڑنے آئے۔ مگر زباب اور میسم گاڑی تک ساتھ آئے۔

”کل ہم انتظار کریں گے۔ امی کو ضرور بھیج دیجیے گا۔۔۔“ اُس نے کہا تو وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے۔

اُس کے سر پہ پیار دیکر منڈے۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

جس راستے سے باپ کی گاڑی نکل کر واپسی کے سفر پر گئی تھی۔ اُس راستے پہ زباب کا دل بچھا ہوا تھا۔ بہت ساری باتیں پوچھنے کی چاہت دل میں ہی رہ گئی۔ دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی۔ کاش میرے گھر کی منڈیر پر کوا

صبح ہی آکر بتا جاتا کہ زباب آج تیری قسمت بدلنے والی ہے۔ آج تیرا باپ تجھ سے ملنے آنے والا ہے تو بھلا وہ شاپنگ کے لیے کیوں جاتی؟ بلکہ وہ راہوں کو سجاتی، گیت گاتی۔۔۔ ناچتی۔۔۔ گاڑی کب کی جاچکی تھی۔ اس وقت دل بڑا ہی ہلکا ہلکا ہو چکا تھا۔ سب اندر چلے گئے تھے۔ حتیٰ کہ میسم جو اُسکے برابر میں ہی موجود تھا، اب وہاں نہیں تھا۔

وہ مسکراتی ہوئی۔ اندر کو آگئی۔ ہال میں طلال اپنے پوتے کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ لہنی اور ملی اپنے کمرے میں جاچکی تھیں۔ وہ خدیجہ کی آواز سے اُنکی کچن میں موجودگی کا اندازہ لگاتی ادھر ہی آگئی۔ ”فہیدہ یہ دونوں بیک لیجا کر ڈاکٹر شمسہ کے گھر دے آؤ۔ اگر وہ پوچھیں مٹھائی اور پھل کس خوشی میں ہیں؟“ فہیدہ خدیجہ کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔۔۔

”میں بتاؤنگی جی کہ ہریرہ بابا کے نانا ابو آئے تھے۔ وہی یہ سب لیکر آئے ہیں۔“ خدیجہ نے مسکراتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا۔ ساتھ مزید بیک تیار کرتی جا رہی تھیں۔

”ادھر سے ہو آؤ۔ تو یہ سب اپنی گلی میں جتنے گھر ہیں۔ ادھر دے آنا۔ باقی کل دیکھیں گے۔“ ”جی باجی میں جانے سے پہلے یہ کام کر کے ہی جاؤنگی۔“ فہیدہ بیک لیکر نکل رہی تھی۔ جب زباب کو دیکھ کر رُک گئی۔ ”مبارک ہو چھوٹی باجی خیر سے آج پہلی دفعہ آپکے میکے سے کوئی آیا ہے اور پھر خیر سے ہریرہ کی پیدائش پر بڑی باجی نے تو مجھے سوٹ دیا ہی تھا۔ پر آپکی طرف سے کوئی چیز نہیں ملی۔ اب میں نے آپ سے دو سوٹ لینے ہیں۔“

”خیر مبارک کیوں نہیں، دو چھوڑتین سوٹ لے لو۔۔۔ کل لے جانا۔“ فہیدہ خوش ہو کر وہاں سے نکل گئی۔ زباب آگے آئی خدیجہ کے ہاتھ تھام کر چوم لیے۔

”ارے آج اچانک ماں پہ بڑا پیارا رہا ہے؟“ وہ چونک کر مسکراتے ہوئے استفسار کرنے لگیں۔ ”امی آپ بہت اچھی ہیں۔ آج میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ جن سے میں آپکی تعریف کر سکوں۔ یا شکر یہ ہی بول سکوں۔ آج ایک بات ثابت ہوگئی ہے۔ آپ کے بیٹے کی شخصیت میں موجود ساری اچھائیاں انہوں نے اپنے ماں باپ سے ہی پائی ہیں۔ آج میرے ابو کے ساتھ آپ جس محبت اور مان کے ساتھ پیش آئی

ہیں۔ میں عمر بھر کے لیے آپکی احسان مند ہو گئی ہوں۔ کسی نے اُنکو اُنکے ماضی کے سلوک کے بارے میں نہیں جتایا۔ کسی نے کوئی تلخ بات نہیں کی۔ کچھ اُلٹا سیدھا جتایا نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے چہرے کی خوشی دیکھ کر لگ رہا تھا۔ جیسے آپکے سگے بھائی آئے ہوں۔ پھر آپ نے اُنکو سوٹ چادر "مٹھائی اور نہ جانے کیا کچھ دیکر جانے دیا ہے۔ ایسی چاہت تو وہاں نظر آتی ہے نا جہاں بڑے قریبی تعلق ہوں۔ آپس میں بڑی محبت ہو۔ کسی زبردستی کی بنائی گئی بہو کے گھر سے کوئی آئے۔ اُن کے ساتھ کب کوئی اتنا اعلیٰ سلوک کرتا ہے۔"

"اچھا بس کرو اب ایویں تعریفیں کر کر کے شرمندہ کر رہی ہو۔ اُن کی محبت بھی تو دیکھو سارے گھر والوں کے تین تین جوڑے اُٹھالائے ہیں۔ لو بھلا ہٹاؤ اتنا خرچہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"امی یہ سب تو رواج ہے۔ نواسے کی خوشی میں لائے ہیں۔"

"اللہ میرے پوتے کو لمبی نیک زندگی دے۔ جس کی وجہ سے آج نا نا گھر تک آ گیا ہے۔ اور اب تم نے مجھے امی بتلایا ہے۔ آنٹی کہتی تھیں۔ تو یوں معلوم ہوتا جیسے کسی غیر سے مخاطب ہو۔ اب میری بیٹی لگی ہو۔" انہوں نے اُسکو ساتھ لگا کر پیار کیا۔

"سدا خوش و آباد رہو۔ ہماری تو خوشی تم لوگوں کی خوشی میں ہی ہے۔"

"آپ چھوڑیں یہ کام خود ہی فہمیدہ کر دے گی۔ چلیں ہم جا کر ملیجے کے سُسرال والوں کے کپڑے پیک کرتے ہیں۔ کل تو وقت نہیں ملے گا۔"

"ہاں تم چلو شروع کرو جا کر میں بس یہ سب سمیٹ کر آتی ہوں۔"

وہ اُنکے کہنے پر کچن سے نکل آئی۔ ملی کے کمرے کی جانب جاتے پیر رک گئے۔ وجہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا نک سک سا تیار میسم تھا۔ اُس کے قریب آنے سے پہلے اُسکی خوشبو آئی۔ وہ پاس آیا اور اُسی طرح لا تعلقی سے اپنے فون کی سکرین کو دیکھتا ہوا بیرونی دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب ایک دم اُس نے مخاطب کیا۔۔۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

وہ تھما۔ نظریں فون کی سکرین سے اُنھیں فون جیب میں رکھتے ہوئے پلٹا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں تھے۔

”بیگم صاحبہ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ زباب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میسم کی آنکھوں میں اتنی بیگانگی دیکھ کر زباب کو یوں محسوس ہوا۔ اپنے شوہر کو نہیں بلکہ کسی راہ جاتے کو مخاطب کر بیٹھی ہو۔

”آ۔۔۔ آپ کہیں جا رہے ہیں؟“

”جی اپنی ایک دوست کے ساتھ ڈنر پر جا رہا ہوں۔ تفتیش پوری ہو گئی ہو تو کیا اب میں جاسکتا ہوں؟“

”مجھے آپ سے کہنا تھا۔۔۔۔۔“

”ہاں بھئی جانتا ہوں کہ کیا کہنا تھا۔ دیکھو یہ عدالتی کام یوں فٹ سے تو ہونے لگتا ہے۔ وقت لگتا ہے۔ مگر پھر بھی بہت جلد میں تمہاری آزادی کا پروانہ تمہیں دے دوں گا۔ اب تو تمہارے ماں باپ کے ساتھ تعلقات بھی بحال ہو گئے ہیں۔ تمہیں تو اور بھی جلدی ہوگی۔ جلدی سے اس گھر سے جان چھوٹے اور تم اُن کے پاس جاؤ۔ پر ایک بات یاد رکھنا تم اکیلی جاؤ گی۔ ہریرہ نہیں جائے گا۔“ اُس کی حیران سہمی ہوئی آنکھوں میں سردنکا ہیں ڈال کر اپنی بات پوری کی اور نکل گیا۔

زباب کو اپنے گرد سناٹا اُترتا ہوا محسوس ہوا۔ اب جب وہ خوش تھی کہ ساری چیزیں اپنے اصل مقام پر آگئیں ہیں۔ زندگی پُر سکون ہو جائے گی۔ پر یہ کیا ہو گیا۔ میسم کی باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے۔ زندگی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ وہ اتنی حیران تھی کہ آنکھ میں ایک آنسو تک نہ آسکا۔

باتھ روم میں جا کر بھی کتنی دیر تک ٹب کی دیوار پہ بیٹھی خالی الذہنی سے فرش کو دیکھتی رہی۔ باہر ہریرہ کو بھوک لگی تھی۔ لٹنی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ منہ دھو کر باہر نکل آئی۔ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر سب کے درمیان بیٹھی۔ جو کپڑے ملیجہ کی سُسرال کو دینے تھے۔ لٹنی کے ساتھ مل کر انہیں اچھے سے پیک کیا۔ پھر سوٹ کیس میں رکھے۔ جو سونے کے زیورات ڈالیا جانے تھے۔ انہیں اکٹھا ایک جگہ کیا۔ خدیجہ کے ہینڈ بیگ میں رکھ کر اُنکے لاکر میں رکھ دیئے۔

سب کے کل پہننے والے کپڑے سیٹ کئے۔ ڈنر بھی خدیجہ کے کمرے میں ہی کیا۔ وہ لوگ ایک بجے تک فارغ ہوئیں۔ ہریرہ پیٹ پو جا کر کے طلال احمد کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہو جاتا۔ وہ سو گئے تو ملیجہ نے سنبھال لیا۔ وہ بھی سو گئی تو وہ خدیجہ کی گود میں آ گیا۔ مگر اب اُسکو بھی نیند آ گئی تھی۔ آنکھیں مسلتے ہوئے رو رہا تھا۔

”بس بچے اب اس معصوم کو پکڑ لو۔ جو کام رہ گیا ہے۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔ تم جاؤ اب آرام کرو اور ذرا میسم کو فون کر کے پتا کرو ابھی تک آیا کیوں نہیں۔“ طلال احمد پہلے ہی گیٹ روم میں سونے کے لیے جا چکے تھے۔ زباب ہریرہ کو لیکرو ہیں خدیجہ کے بستر میں گھس گئی۔ لہٹی کو حکم دیا۔

”لو جاؤ ذرا اوپر سے ہریرہ کی پیٹی اور کپڑے تو لا دو۔“

لہٹی نے لا دیئے۔ ہریرہ کو پرسکون کر کے وہیں لیٹ گئی۔ خدیجہ اور لہٹی کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر جو نہی نیند نے آغوش میں لیا ساری آوازیں فکریں کہیں دور دیں چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

رات پونے چار کا وقت تھا جب وہ گھر واپس آیا۔ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ لائٹ آن کی۔ بیڈ پر امی کو سوتے دیکھ کر حیران تو ہوا مگر پریشان بھی جو سوال سب سے پہلے ذہن میں آیا۔ وہ یہی تھا کہیں وہ پھر تو کہیں نہیں چلی گئی۔

”ماں۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“

”ہریرہ کدھر ہے؟“ خدیجہ نے آنکھ کھول کر وال کلاک پر نظر ڈالی۔۔۔

”شاباش ہے بیٹے۔ گھر واپس آنے کا یہ بڑا ہی اچھا وقت ہے۔ گئے کہاں تھے؟“ وہ گہرا سانس خارج کرتے ہوئے اُن کے برابر لیٹ گیا۔

”ایک ضروری کام سے گیا تھا۔“

”کمال ہے آدمی رات کو کونسا ضروری کام ہوتا ہے۔ کھانا کھاؤ گے؟“

اس وقت بس سونا چاہتا ہوں۔ پر آپ نے بتایا نہیں ہریرہ کدھر ہے؟“

”ہریرہ یا اُسکی ماں۔۔۔“ میسم کو ہنسی آگئی۔

”اُسکی ماں سے مجھے کیا لینا۔ مجھے بس ہریرہ سے غرض ہے۔“

”ہاں ہاں جانتی ہوں۔ نیچے میرے کمرے میں سو رہی ہے۔ جاؤ جا کر تھوڑی نیند لے لو۔“

”کوئی خاص وجہ جو وہ آج ادھر سوئی ہے؟“

”تم جو گھر نہیں تھے۔ اُس کا بھی تمہارے بغیر اپنے کمرے میں دل نہیں لگتا ہوگا۔“
میمم کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”ماں وہ احتجاجاً ادھر سوئی ہے۔ میری محبت میں نہیں۔“

”کیسا احتجاج۔۔۔؟“

”کسی اور وقت بتاؤں گا۔ ابھی تو آپ آرام کریں۔ سوری میں نے آپ کی نیند خراب کی۔“
انہوں نے اُسکی پیشانی چومی اور جانے کا اشارہ دئے کر آنکھیں بند کر لیں۔

بوٹ جرائیں اُتار کر چپل پہنی جیکٹ اُتار کر وہیں بیڈ پر پھینکی۔ لائٹ کے بعد اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا نیچے آگیا۔ امی کے کمرے کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ ابھی دروازہ واہی کیا تھا۔ ہریرہ کی گوں گوں سنائی دی۔ مین لائٹ آن کی، سامنے بیڈ پر ہریرہ پیٹ کے بل ہو کر سر اٹھا اٹھا کر آوازیں نکال کر ماں کو متوجہ کرنے کی کوششوں میں تھا۔ رُباب بے خبر سو رہی تھی۔ میسم نے لائٹ تھوڑی ڈم کی اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا بیڈ کے قریب آیا۔ اپنا موبائل اور والٹ نکال کر سائیڈ دراز پر رکھا۔ ہاتھ بڑھا کر ہریرہ کو اٹھا کر دو تین اکٹھے بوسے لیے۔

”ہیلو۔۔۔۔ کیا آپ میرے استقبال میں جاگ رہے ہو؟“ ہریرہ کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھ کر سرگوشی میں پوچھا جواب میں ہریرہ نے اُسکے بال دونوں ٹٹھیوں میں جکڑ لیے۔

”اچھا یا رمانا کہ لیٹ آیا ہوں۔ پر اب میرے بال اُتار کر تو سزا نہ دو۔ پہلے ہی میری بیوی مجھے گھاس نہیں ڈالتی گنجا کر دو گے تو باہر کی عورتیں بھی نہیں پوچھیں گی۔“

اب ہریرہ اُس کے گال کو کھانے کے چکر میں زور زور سے اپنے بغیر دانٹوں والے منہ سے دندی کاٹ رہا تھا۔

”میرا بھوکا شیر۔۔۔“ وہ بیڈ سائیڈ پر رکھے کور میں سے فیڈر نکال کر ہریرہ کو دیتے ہوئے گُری پر بیٹھ گیا۔

ہریرہ آنکھیں مٹکا مٹکا کر اُسکو دیکھتے ہوئے فیڈر پی رہا تھا اور میسم گہری سوچ میں ڈوبا کبھی کبھی ایک نظر رُباب کے بستر میں سے جھانکتے بالوں کو دیکھ لیتا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے دونوں باپ بیٹا سو گئے۔

رُباب عادت کے مطابق اٹھی۔ ہریرہ کو غائب پا کر ہڑبڑا کر بستر سے نکلنے کو تھی۔ جب نظر میسم پر پڑی۔

ٹانگ پر ٹانگ رکھے۔ سینے پر ہریہ کو لٹائے دونوں ہاتھوں میں اُس کو تھامے سر ایک طرح کو لڑھکا ہوا تھا اور وہ سو رہا تھا۔ اپنے بالوں کا جوڑا بنا کر بازو پہ پہنا بینڈ ڈالا۔ دوپٹہ اوڑھ کر اٹھی۔ پیروں میں چپل ڈالے۔ میسم جیسے قد کاٹھ والے آدمی کی گود میں چھوٹا سا ہریہ اور بھی چھوٹا لگتا۔ ابھی بھی وہ کسی خرگوش کی طرح باپ سے چٹ کر سو رہا تھا۔ رباب کو لگا دنیا میں اس سے زیادہ حسین منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ دراز پہ رکھا میسم کا فون اٹھا کر کئی تصویریں لے ڈالیں۔ فلیش کی لائٹ نے میسم کی نیند توڑی تھی۔ رباب نے فون واپس رکھا اور آگے بڑھ کر ہریہ کو اٹھا کر بیڈ پر ڈال دیا۔ میسم خود ہی آکر بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

سارے فنکشن کا انتظام لا جواب ہوا تھا۔ مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ گارڈن میں بڑا سا فوٹ ٹینٹ لگا کر ہال بنایا گیا تھا۔ جس میں بہت سارے گول میز رکھے گئے تھے۔ جن کی کرسیوں پر سفید کورچڑھا کر بیک پر سلک کے کپڑے سے بڑے بڑے لائٹ پنک بونائے گئے تھے۔ ہر میز پر سفید لٹی پنک ٹیلوپس اور مختلف قسم کے ہرے پتوں سے ڈیکوریشن کی گئی تھی۔

سادہ سا تھیم مگر بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سارے سٹیج پر بھی انہی تین رنگوں سے سجاوٹ ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک کریم سیٹی رکھی گئی تھی۔ جس پر صرف لڑکا لڑکی کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اُن کی طرف سے آنے والے سب مہمان پہنچ چکے تھے۔ لڑکے گیٹ سے باہر کھڑے ہو کر لڑکے والوں کے پہنچنے کے انتظار میں تھے۔ میسم کی کلاس کے بھی لڑکے لڑکیاں آئے ہوئے تھے۔ ملیحہ کی طرف سے ملیحہ نے صرف خاص خاص دوستوں کو بلوایا ہوا تھا۔ وہ ساری ایک میز پر گروپ کی شکل میں بیٹھی اشتیاق سے آتے جاتے افراد کو دیکھ رہی تھیں۔

طلال احمد نے سفید کرٹڈی کے سوٹ پر کالی واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اُن کے پہلو میں کھڑی خدیجہ لائٹ سی گرین رنگ پہنے ہوئے بلا کی گریس فل لگ رہی تھیں۔

مگر سب میں نمایاں وہ تھا۔ لڑکی کا بھائی، میسم طلال۔۔۔۔۔ سلور گرے ٹاکسیڈو کے ساتھ ٹی پنک ٹائی خوبصورتی سے سیٹ کئے گئے بال۔ براؤن ڈریس جوتے، چہرے پر نمد باری، ذمہ داری سے سب کو ملتا، ویلکم

کرتا۔ ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے تو تھا ہی مگر اس بات سے بھی بے خبر نہیں تھا کہ وہ خود بھی اس وقت کئی نگاہوں کا مرکز ہے۔ گیٹ پر آ کر کھڑا ہوا۔ بے چینی سے ایک نگاہ اپنی رسٹ وائچ پہ ڈالی۔ جس کا اُسکی نگاہوں کو انتظار تھا۔ وہ ملیجہ کے ساتھ پار تیار ہونے لگی ہوئی تھی۔ تبھی اُسکی گاڑی آ کر رُکی جسے بلال چلا رہا تھا۔ پیچھے مہمانوں کی گاڑیاں بھی پہنچ گئی تھیں۔ اُس نے بلال کو اشارہ دیا کہ وہ گاڑی سیدھی پورچ میں لے جائے۔

پہلے اگلی مینجر سیٹ کا دروازہ کھول کر نکلنے والی لہنی تھی۔ کالے سوٹ میں مناسب میک اپ کے ساتھ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ لہنی نے پچھلا دروازہ کھول کر اُسے باہر نکلنے میں مدد کی۔ میسم کی نگاہیں اُدھر ہی تھیں۔ نکلنے والی ملیجہ تھی۔ کریم رنگ کے روایتی شرارہ سوٹ میں وائٹ گولڈ جیولری میں پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ وہ بے اختیار دو قدم آگے آیا۔ بہن کو ساتھ لگا کر ڈعادی۔

سامنے نظر اٹھی تو ٹھکنا بھول گئی۔ پہلے تو حیرانی سے ماتھے پہ تیوری لیکر دیکھا آیا وہی ہے یا کسی اور پر اُسکا دھوکا کھا رہا ہوں۔ ہریرہ کو بلال کے حوالے کرتی وہ یقیناً زباب میسم ہی تھی۔ لمحہ بھر کو تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بیج گولڈن بناری ساڑھی جس کے ٹی پنک پلو کا بارڈر بھی بیج گولڈن ہی تھا گولڈن ہی پھول بنے ہوئے تھے۔ کھلے بالوں میں موچے کے پھول لگا کر ہیر سٹائل بنایا گیا تھا۔ ٹنڈن کا زیور پنک رنگ کی ہیل پہنے وہ اپنے روزمرہ کے انداز سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ ساڑھی میں اُسکا مناسب فیکر میسم طلال کے دل پر نہ جانے کیسی کیسی قیامتیں ڈھا گیا۔ وہ جان بھی نہ پائی۔ اس سے پہلے کہ زباب اُسکی طرف متوجہ ہوتی وہ اپنے دل کو سمجھا بچھا کر نظر پھیر چکا تھا۔ ویسے بھی آج صبح سے دونوں نے ایک دفعہ بھی ایک دوسرے کو مخاطب نہ کیا تھا۔ وہ اسی ایک بات پر یقین رکھے ہوئے تھی کہ کل رات وہ اپنی کسی دوست کے ساتھ ڈنر پر تھا۔ جو آج بھی یقیناً پارٹی میں شامل ہونے والی تھی اور اُس مہ جبین کا زباب کو بے چینی سے انتظار تھا۔

لہنی نے اُسکے ہاتھ میں گجروں والی ٹوکری دی۔ جس میں مہمان خواتین کو استقبال میں دینے کے لیے موچے کے گجرے تھے۔ میسم، طلال احمد، بلال اور اُسکے والد کے علاوہ میسم کے چاروں جگری یا مردوں کے استقبال کو آگے بڑھے۔ خواتین والی سائیڈ پر زباب اور لہنی گجرے دے رہی تھیں۔ سارے مہمان ایک ایک کر کے اندر چلے گئے۔ وہ گجروں کی خالی ٹوکری ملازمہ کو تھما کر اندر کی جانب

بڑھنے والی تھی۔ جب کسی کی گرفت نے اُسکے قدم روک دیئے۔ اُسکی چوڑیوں سے بھری کلائی میسم کے ہاتھ میں تھی۔ اسی طرح تھامے وہ اُسکو ایک سائیڈ پر لے گیا۔ ہیل پہننے کے باوجود وہ اُسکی کپٹی تک آرہی تھی۔ ایک نظر میسم پر ڈالنے کے بعد اُسکی جرات نہ ہوئی دوبارہ نظر بھر کر اُس کو دیکھ پاتی۔ دل پسلیاں توڑ کر بھاگنے کے پروگرام میں لگ رہا تھا۔

”آپ کو کچھ کہنا تھا۔ تو ادھر ہی کہہ لیتے یوں کھینچ کر لانے کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ رات والی ناراضگی دیکھاتے ہوئے بولی۔ میسم نے ناک کے ذریعے گہرا سانس اندر کو کھینچ کر اُسکی خوشبو کو محسوس کیا۔

”آج اس لباس کے انتخاب کی کیا وجہ ہے؟“

”وجہ میری مرضی ہے۔ ساڑھی میرا پسندیدہ لباس ہے۔ اور مجھے ساڑھی پہننے کا ہمیشہ سے بڑا شوق رہا ہے۔“ میسم نے منہ ہناتے ہوئے بھنویں اچکائے۔۔۔

”آئی سی۔۔۔ اگر ایسا ہے۔ تو نیگم صاحبہ اپنے پلو کو اتنی احتیاط سے کیوں لپیٹ رکھا ہے۔ ریلیکس کرو۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں۔ آج میں نے اپنی ایک خاص دوست کو بھی یہاں نکالایا ہوا ہے۔ کہیں اُسکے سامنے میری سکی نہ کروا دینا۔ اجازت ہو تو یہ گجرے پہنا دوں۔ شاید ٹوکری میں بچ گئے تھے۔ میں نے سوچا ایویں خراب نہ ہو جائیں۔“

زباب نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ دل جل کر خاک ہو گیا۔ بمشکل اپنے اندر اٹھتے غم کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔

”آپ مجھے اپنی کسی اہم یا غیر اہم مہمان سے مت ملوایئے گا اور یہ گجرے بھی اُسی کو پہنائیئے گا۔ مجھ پر یہ احسان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوا کر تیزی سے نکل گئی۔ وہ نچلا لب چباتے ہوئے زباب کی پشت کو گھور کر رہ گیا۔ زباب کے گھر سے امی اور عبداللہ آئے تھے۔ وہ وقتی طور پر سب بھول کر ابھی کے کھل لمحے میں زندہ ہو گئی۔ اسکے بعد جو بچ کا جھٹکا آنے والا تھا۔ اُسکی جانب سے آنکھیں بند کر لیں۔ رسم سے پہلے سب نے کھانا کھایا۔ پھر ملیحہ اور ریحان نے ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائی۔

اُسکے بعد سب نے اپنی طرف سے دونوں کو تحفے تحائف دیئے۔ فیصل ہاتھ میں پکڑی کولا کی بوتل میں سے گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ نظریں سامنے والے میز پہ موجود حسینہ پر جمی ہوئیں تھیں۔ جو پوری طرح اپنے ساتھی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ لہٰذا کب کی یہ سین دیکھ رہی تھی۔ ایک عدد کولا کی بوتل لیکر فیصل کے ساتھ والی کرسی پہ آکر بیٹھ گئی۔ فیصل کا دھیان ادھر ہوتا تب نا۔۔۔

اُس نے فیصل کے ہاتھ سے خالی بوتل لیکر بھری ہوئی تھادی۔

”ویسے دیکھنے میں تو یہی لگ رہا ہے کہ انگور کھٹے ہیں۔“ جواب میں فیصل نے گہرا سانس خارج کیا۔

”کھٹے کہاں جناب والا نراسر کہ ہیں۔“

”بس قسمت قسمت کی بات ہے۔ اُس انگور کی قسمت میں وہی لنگور ہے۔ لہٰذا آپ کولا کو شراب سمجھ کر پینا

بند کر دیں اور شکر کریں جانو نہیں تو نہ سہی ماموں تو بن ہی جائیں گے۔“

”بی بی آپ میرے زخموں پر نمک چھڑکنے آئیں ہیں یا کوئی اور کام بھی ہے؟“ فیصل نے مصنوعی غصے سے گھورتے ہوئے اُسکو پیچی آنکھوں سے دیکھا۔

”ہاں کام تو بڑا اہم ہے۔ پتا نہیں آپ کرتے ہیں یا نہیں۔“

”اچھی تنخواہ ملے تو کر ہی لوں گا۔ ویسے بھی ابھی میں بے روزگار ہی ہوں۔ ورنہ میں ادھر بیٹھنے کی بجائے سحرش کے پہلو میں بیٹھا ہوتا۔“

”اوہ آئی سی تو اس فتنے کا نام سحرش ہے۔ خیر آپ سمجھ لیں آپ کی لاٹری نکل آئی ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ میرے ابا کو ایک عدد داماد چاہیے۔ پوسٹ اچھی ہے۔ فیوچر ایکدم برائٹ، مزید ترقی کے چانسز بھی ہیں۔“

”داماد کے عہدے میں بھلا کہاں سے ترقی کے چانسز نکلتے ہیں؟“

”اب ساری عمر ایک شوہر اور داماد تو نہیں رہیں گے نا۔ آخر ایک دن ابا بھی بنیں گے۔“

فیصل کو اچھو لگ گیا۔

بوٹل واپس میز پر ڈالی۔۔۔ ایک نظر سرتا پالنبی کو دیکھا۔ جو اپنی بوٹل سے گھونٹ لیتے ہوئے سامنے بیچ پر بیٹھے جوڑے کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ وہی ہیں ناں میسم کہ کراچی والی کزن آبدوز۔۔۔ جو کھاتی بہت ہے۔ منہ پھٹ بھی بڑی ہے۔ جسکو شاپنگ سے عشق ہے۔“

”ارے واہ۔۔۔ میں تو آپ کو ایویس لا پرواہ سمجھتی تھی۔ آپ نے تو بڑی ریسرچ کی ہوئی ہے۔“

”ہاں جی خطروں سے بچ کر چلتا ہوں۔ اسی لیے خود کو اپ ڈیٹ رکھنا پسند کرتا ہوں۔“

”چلیں کوئی نہیں آپ مجھے بزدل بھی قبول ہیں۔“

”اسکو بزدلی نہیں شرافت کہتے ہیں۔“

”کہتے ہو نگے۔۔۔ کیا آپ کو میرا پوزل قبول ہے۔ یا آپ کے گھر والوں سے بات کرنی پڑے گی۔“ فیصل کے طوطے اڑ گئے۔

”آپ میری طرف سے معذرت قبول کریں۔ دوست کی بہن میری بہن ہے۔“

”کینے میں تمہارے دوست کی بہن نہیں ہوں۔ اب بہن بولانا تو رکھ کے چماٹ ماروں گی۔“

بڑی نظروں سے گھورتی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ فیصل نے اگلے لمحے ہی جاسم کو پکڑا اور سب اُسکے گوش گوا کر دیا۔ میسم نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”یار مجھے سمجھ نہیں آرہی اسکو تمہاری بھنڈی جیسی شکل میں ایسا کیا ہیر و نظر آ گیا ہے۔“

”کیا مطلب تو پہلے سے جانتا ہے؟“

”جی کب سے وہ مجھ سے باتوں باتوں میں تمہارا ذکر کرتی آرہی ہے۔“

”اور تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟۔۔۔ پہلی دفعہ کسی لڑکی نے تیرے بھائی کے لیے اچھے الفاظ استعمال کئے اور سالے تو نے مجھے بتانا بھی گوارا نہ کیا۔ ڈوب مر کہیں۔۔۔ مجھے اب سنجیدگی سے جاب ڈھونڈنی پڑے گی۔ آخر

امی کو کراچی رشتہ لینے بھیجنا ہے۔“

”وہ چلتا پھرتا خرچہ ہے۔ اُسے بھول جا۔۔۔۔“

”میں کس کس کو بھولوں بس اب سے یاد رکھنا ہے۔“ میسم نے تاسف سے سر ہلادیا۔



فوٹو گرافی کا طویل سلسلہ جب تک ختم ہوا، زیادہ تر مہمان رخصت ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اپنے قریبی دوست احباب ہی بچے تھے۔ لڑکے والے جب چلے گئے اُسکے بعد خالص گھریلو سی تقریب کا آغاز میسم کے دوستوں کی جانب سے ہوا۔ سٹیج کے سامنے قالین پر ڈھولک رکھ کر بیٹھ گئے۔ ایک کے ہاتھ میں گٹار تھا۔ لڑکوں نے ایک کے بعد ایک پنجابی نمبر گا کر ساری محفل لوٹ لی۔ امی لوگ اُن پر سے پیسے وار کر اُنہی کو دے رہی تھیں۔ سب کا دھیان ڈھولکی اور گیتوں کی جانب تھا۔ سوائے میسم اور زباب کے۔ میسم کی ساری توجہ اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی سرخ فراک میں چمکتی حسینہ پر تھی۔ جو بات بے بات تھقبہ لگا رہی تھی۔ خلیلی سی لڑکی بلاشبہ پریوں جیسی صورت والی تھی۔ زباب اُسکے چہرے کو کیا دیکھتی نظریں اُسکی نازک کلائی پر موجود گجروں سے اوپر اٹھتی ہی نہ تھیں۔ اندر ہی اندر نہ جانے کتنے آنسو بہتے گئے۔

تو میسم طلال تم نے فیصلہ کر ہی لیا۔ پر کیا اب ایسے فیصلے کی گنجائش تھی؟

ہریرہ اپنی نانی کی گود میں سویا ہوا تھا۔ جو سارے ہنگامے سے بے نیاز بس اپنے نواسے کا چہرہ پڑھ رہی تھیں۔ عبداللہ کو بلال نے نہ جانے کن قہے کہانیوں میں مصروف کیا ہوا تھا۔ زبردست ہونگ ہو رہی تھی۔ وہ چونک کر اپنی سوچوں سے نکلی۔ گٹار میسم کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ سٹیج کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ جیکٹ اتار کر کف فولڈ کر لیے تھے۔ اُس نے گٹار کا پہلا نوٹ ہی لیا تو تالیاں گونجیں۔ پہلے نوٹ نے ہی بتا دیا۔ وہ اناڑی نہیں تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر بڑی سنجیدگی سے ایک ایک تار چھیڑتا چلا گیا۔ ایک پیرا آ کر اُس کے سامنے مائیک فٹ کر گیا۔ اُس کے سبھی دوستوں کے موبائل اُنکے ہاتھوں میں تھے۔ اور اُنکی سکرین پر میسم طلال نظر آ رہا تھا۔ اُس نے سر اٹھا کر کیمروں کے چمکنے فلش دیکھے اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”کینو۔۔۔ خبردار جو تم لوگوں نے مجھے میری ہی ویڈیو بنا کر سینڈ کی۔“

فیصل بولا۔ ”نہیں چڑیا گھر والوں کو بھیجی ہے۔ تاکہ اُنکو علم ہو اُنکے یہاں سے بھاگا بندر ادھر سنگر بن کر داد لے رہا ہے۔“

”شرم کرو۔ آج ادھر میرے سُسرالی بھی موجود ہیں۔ خیر یہ گانا میں آج شام کی سب سے حسین لڑکی کو ڈیڈی کیٹ کرنا چاہتا ہوں۔“ تالیاں بجائی گئیں۔ جب وہ بول رہا تھا زباب نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ اُسکی ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ مگر جب زباب نے نظر اٹھائی وہ نگاہ بدل گیا۔ جو جو یہ کھیل ملاحظہ کر رہے تھے۔ اُنکا قہقہہ گونجا۔ باقی سب حیران ہی ہو رہے تھے کہ آخر اتنی پیاری بیوی ہونے کے باوجود میسم ایمان نامی لڑکی پر لٹو کیوں ہو رہا ہے۔ شہباز تو باقاعدہ اُسکو گھور رہا تھا۔ فیصل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میسم کے سامنے چڑھ کہ بیٹھی ایمان کو اٹھا کر کالے پانیوں میں پھینک آتا۔ بے چارے پریشان ہو کر بار بار زباب کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ جس کے چہرے پر دھیمی سی رسمی مسکراہٹ تھی۔ دل و دماغ پر جو بیت رہی تھی۔ وہ چہرے سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ میسم نے گانا شروع کیا تو ساری خاموشی چھا گئی۔ بھاری پُر اثر لہجہ سُر میں آواز نظریں جھکائے گا رہا تھا۔ اور زباب کو لگا سینے میں دھڑکتا دل بند ہو جائے گا۔

”جے ٹو اکھیاں دے سامنے نہیں رہنا۔۔۔“

تے پیسا ساڈا دل موڑ دے

اساں نت داو چھوڑا نیو سہنا تے پیسا ساڈا دل موڑ دے

انج دور دور رہ کے نیو چٹ لگنا۔۔۔۔۔

اساں دیدہ نا نئی گج ہو ر منگناں

ساڈے کول جے نئی کڑی پل بیہنا تے پیسا ساڈا دل موڑ دے

جیتو اکھیاں دے سامنے نئی رہنا تے پیسا ساڈا دل موڑ دے۔۔۔

تینوں چائی دے نے دل والے بھیت کھولنے

اساں تیرے نال کئی ڈکھ سکھ پھولنے

اے وئی نکا جیا منا نئی کہنا تے پیسا ساڈا دل موڑ دے۔۔۔۔۔

جے تو اکھیاں دے سامنے نئی رہنا تے پیسا ساڈا دل موڑ دے۔

اساں نت داو چھوڑا نیو سہنا تے پیسا ساڈا دل موڑ دے۔۔۔۔۔

گاتے گاتے اُس نے سامنے دیکھا تو شدید مایوسی ہوئی۔ زباب اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ اُچھتی سی نظر ہال پر ڈالی تو اسکو ٹینٹ کے دروازے سے باہر جاتے دیکھا۔ گانا وہیں بند کر دیا۔ سب نے ایک دفعہ پھرتالیاں بجا کر داد دی۔ وہ بھی مسخروں کی طرح اپنی جگہ کھڑا ہو کر آگے کو جھکا۔ فلائنگ کس دیے اور اگلے بندے کو دعوت دیکر خود ایک دفعہ پھر ایمان کے پاس جا بیٹھا۔

آہستہ آہستہ بڑوں کا گروپ وہاں سے کھسک گیا۔ پیچھے ساری ایک پارٹی بچی۔ مگر زباب واپس نہیں آئی۔ حالانکہ کسی کی پر امید نگاہ مسلسل دروازے کی جانب انتظار میں اُٹھتی اور جھکتی رہی۔ بلاخر محفل برخاست ہوئی۔ وہ باہر کی جانب جا رہا تھا تا کہ فیصل وغیرہ میں سے کسی کے ساتھ مس ایمان کو اُسکے گھر بھیج سکے۔ ابھی لان عبور نہیں کیا تھا۔ جب اپنی بالکونی میں کسی کی موجودگی کا شک سا ہوا۔ بس پھر کیا تھا۔ تصدیق کی بھی ضرورت نہ جانی۔ وہیں کھڑے ہو کر ایمان ڈارلنگ کو آنے کا بولا۔ وہ شرماتی ادائیں دکھاتی مٹکتی چکتی آئی۔ میسم نے اُسکے لیے اپنے ہاتھوں سے اپنے برابر کی سیٹ کا دروازہ کھولا ہے۔ ایمان جی کے بیٹھنے پر اُس نے جھک کر دروازہ بند کیا۔ جیب سے چابی ٹٹوتا دوسری طرف جا کر ڈرائیونگ سنبھال لی۔ گاڑی گیٹ سے نکل گئی۔ بالکونی پہ موجود فرد اندر چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ پوری سنجیدگی سے سامنے روڈ کو ہی دیکھتا گیا۔ ایمان کو اُسکی رہائش پر اتار تے ہی گاڑی واپسی کے راستے پر ڈالی۔ چہرے پر مسلسل مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مگر جیسے ہی اپنے گیٹ پر پہنچا مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ نوکر دو بیک عبداللہ والی کار کے ڈگی میں رکھ رہا تھا۔ امی اور خالہ لوگ سب وہیں کھڑے تھے۔ زباب سب سے مل رہی تھی۔ ماتھے پر تیوری لیے وہ گاڑی کا انجن چلتا چھوڑ کر باہر آیا۔

”ادھر کیا ہو رہا ہے؟“

اُسکے سوال کا جواب خدیجہ کی جانب سے آیا تھا۔ ”اوہ تم آگئے ہو۔ ہریرہ سے مل لو کیونکہ وہ کچھ دنوں کے لیے اپنی نانی کے گھر جا رہا ہے۔“

”پریوں اچانک۔۔؟“

”اچانک تو نہیں ہے۔ بھائی صاحب سے تو یہی وعدہ کیا تھا کہ مگنی کے بعد زباب کو بھیج دیں گے۔“

اب وہ سب کے سامنے کیا کہتیں رُباب نے اچانک ہی جانے کا فیصلہ سنایا ہے۔ اس بات پر میسم نے ردِ عمل دیکھنا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی عادت کے مطابق بات کو سنبھال رہی تھیں۔ وہ بھی میسم تھا۔ ماں نے نہیں بتایا پر وہ سمجھ گیا تھا۔ سیدھا رُباب سے مخاطب ہوا۔

”کیا اسی وقت جانا ضروری ہے؟“

ڈارک گلاسز کے پیچھے سے اُس نے کہا کچھ نہیں، بس اثبات میں سر ہلایا۔

”چلو پھر میں چھوڑ آتا ہوں۔“

وہ تیزی سے بولی۔ ”اسکی ضرورت نہیں ہے۔“ اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

میسم نے اپنی ماں کو ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”آپ اسکی حرکتیں دیکھ رہی ہیں؟“ خدیجہ نے جواب میں اپنے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تھکی دی۔ اور سرگوشتی میں بولیں۔۔۔

”میں اُسے ہی نہیں تمہیں بھی دیکھ رہی ہوں۔“ وہ اُنکا اشارہ سمجھ کے غصے کے باوجود ہنس پڑا۔ جبکہ خدیجہ نبیلہ بیگم سے ملتے ہوئے شکوہ کر رہی تھیں۔

”کم از کم آپ کو توڑ کنا چاہیے۔ آج آئیں ہیں اور آج ہی واپسی۔“

”ضرور رکتی مگر آج کل گندم کی بوائی کا سیزن ہے۔ اسی لیے توڑ باب کے ابو بھی آج نہیں آپائے۔ انشا اللہ اب آپ لوگ آئیے گا۔ یہ نہ ہو مجھے جھوٹے وعدے پر ٹر خادیں۔“

”نہیں بھی ضرور آئیں گے۔ ویسے بھی ہریرہ کے بغیر یہاں اب کس کا دل لگتا ہے۔ کل پرسوں ہی اسکو لینے آ جائیگے۔“ طلال احمد کی بات پر سب کو اتفاق تھا۔

نبیلہ نے لُٹنی کے والدین کو علیحدہ سے دعوت دی۔ سب سے ملنے ملانے کے بعد جب وہ گاڑی کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ میسم نے عبداللہ سے اسکی گاڑی کی چابی لی۔ اور اُسکو اپنی گاڑی کہ جانب بھیج دیا۔ نبیلہ بیگم بھی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ عبداللہ کے ہمراہ ہوئیں۔ ملیحہ نے ہریرہ کو رُباب کی گود میں دیا۔ جو سفید چادر سے ڈھیلا سانقلاب کئے کچھلی سیٹ پر براجمان تھی۔ عبداللہ نے گاڑی پیچھے سے ہٹائی تو میسم نے اپنی سیٹ سنبھالی۔ رُباب بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ جس سے ناراض ہو کر وہ اتنی ایمر جنسی میں جا رہی تھی۔ وہ لاڈ صاحب خود

”اصولی طور پر تو تمہاری منزل میں ہوں۔ تم مجھے خوار کر رہی ہو؟“

”اسی لیے میں جا رہی ہوں۔ تاکہ میری وجہ سے آپ مزید خوار نہ ہوں۔“

”خیر ابھی تو اٹھ کر آگے آؤ۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“ میسم نے اسکی گود سے ہریہ کو لے لیا۔

”میں آگے نہیں آؤں گی۔ اس لیے وقت ضائع نہ کریں۔“

میسم بولا تو لہجے میں سختی تھی۔ ”تم ابھی آگے آ کر بیٹھو گی یا میں گاڑی واپس گھر کو ڈالوں گا۔ اسکے علاوہ تیسرا کوئی

راستہ نہیں ہے۔“

”مجھے آپ سے بے انتہا نفرت ہے۔ کاش آپ میری زندگی میں نہ آئے ہوتے۔“ وہ پیر پختی آنسو بہاتی

آ کر آگے بیٹھ گئی۔ میسم ابھی تک اپنی سیٹ پہ ترچھا ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ ہریہ بھاگ بھاگ کر سٹیرنگ وٹیل تھا منے

کی کوشش میں مصروف تھا۔ میسم کی خوشبو سے پیچھا چھڑانے کے چکر میں اس نے دوبارہ سے چادر ناک کے

آگے تان لی۔

”کتنے دنوں کے لیے جا رہی ہو؟“

”ہمیشہ کے لیے۔۔۔“

”سوچ لو کیا کہہ رہی ہو۔“

”سب سوچ لیا ہے۔۔۔“

”مگر ہریہ کو میں نہیں چھوڑ سکتا۔“

”میں بھی نہیں چھوڑ سکتی۔“

”پھر کیا حل کرنا ہے؟“

”کرتے رہیں جو بھی حل کرنا ہے۔ بس مجھے میرے ابو کے گھر چھوڑ آئیں۔“

”تم انتہائی مطلبی اور گھمنڈی عورت ہو۔ مجھے تم نے سمجھا کیا ہوا ہے؟ کوئی بچہ ہوں۔ جسے جب چاہے اپنے

اشاروں پہ نچاتی رہو گی یا اپنے ڈراموں سے بلیک میل کر لو گی۔“

”میں نہیں جانتی آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔۔۔ پہلے تمہیں یہ تکلیف تھی۔ میں دنیا کہ سامنے تم سے نفرت کا اظہار کیوں نہیں کرتا۔ تمہارے گرد پروانے کی طرح کیوں گھومتا ہوں۔ اب اگر میں تمہیں تمہارے حال پہ چھوڑ کر کسی اور لڑکی کی جانب متوجہ ہوا ہوں تب بھی تم سے برداشت نہیں ہو رہا۔ اگر تم بھول گئی ہو تو میں یاد کروادیتا ہوں۔ میں وہی ہوں جسکو تم نے ایک سال تک سولی پر لٹکا کر رکھا ہے۔ میرے خلاف کورٹ میں کیس کیا ہوا ہے۔ آج آؤٹ آف بیلو تمہارے ماں باپ آتے ہیں۔ تو تم چاہتی ہو۔ میں گزرا سارا وقت بھول کر تمہارے ساتھ پپی لائف کھیلوں جیسے ہمارے درمیان کوئی اختلاف کبھی تھا ہی نہیں۔ اخلاقی طور پر میرے کسی کے ساتھ ملنے اٹھنے بیٹھنے پر تمہیں یہ بچگانہ رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ کل تک تم اپنے ماں باپ کا ذکر سننے پر آمادہ نہیں تھیں۔ آج مجھ سے پوچھے بغیر یوں منہ اٹھا کر وہاں جا رہی ہو۔ تم دو منٹ بیٹھ کر یہ فیصلہ کیوں نہیں کر لیتیں کہ آخر تم چاہتی کیا ہو۔“ مضبوط و مستحکم لب و لہجے کے ساتھ وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔ زباب نے ساری بات پورے دھیان سے سنی آنسو زک گئے۔ دو چار سیکنڈ کے لیے تو بالکل ساکت رہ گئی۔ نظریں سامنے آتے جاتے لوگوں پر جمی تھیں۔ دماغ میسم کے الفاظ میں الجھ گیا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا آپ کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کروں۔ مگر جس طرح آپ میرے والدین سے ہتے ہوئے ملے تھے۔ مجھے لگا آپ انکو معاف کر چکے ہیں۔“

”میں اتنا کمینہ نہیں ہوں کہ اپنے گھر آئے کسی انسان سے حساب کتاب کھول کر بیٹھوں۔ مگر اسکا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ میں اپنے ساتھ ہونے والے غیر انسانی سلوک کو معاف کر چکا ہوں۔“

زباب کو لگا آج ہی سارے حساب بے باک ہونے کا دن ہے۔ ڈوبتے سورج نے روشنی میں کمی کر دی تھی۔ لوگ بتیاں جلا کر اندھیرے کا استقبال کرنے میں مصروف تھے۔ شاید انکے پاس اپنا راستہ روشن کرنے والا چراغ نہیں رہا تھا۔ دل ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔ تو کیا یہی آخر ہے؟ انہی سڑکوں پر نصیب کے تار ملے تھے۔ کیا انہی پر ٹوٹ جانے ہیں۔۔۔؟ یوں لگا سانس کہیں انک رہی ہے۔ بڑی مشکل سے کانپتی سی سانس اندر کھینچتے ہوئے بولنے کی ہمت ڈھونڈی۔۔۔۔

”آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ میرے ماں باپ کی جانب سے بھی اور پھر میری جانب سے بھی۔ میں

اپنے ماں باپ کی طرف سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ جہاں تک رہی میری اُن سے ملنے کی بات۔۔۔ میں اُنکو کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے اُن سے شکوے ہیں۔ مجھے اُنکی طرف سے بہت ڈکھ ملا ہے۔ پر میں اُنکو چھوڑ نہیں سکتی ہوں کیونکہ وہ میرا اصل ہیں۔ اللہ اور رسول کے بعد ماں باپ سے آگے کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے اُن سے اپنے ساتھ رکھے گئے رویے کے بارے میں جواب درکار ہیں۔ پر میں اُن سے منہ نہیں موڑ سکتی۔ میں آج تک اسی لیے بے چین تھی۔“

”چلو اب وہ مل گئے ہیں۔ اپنے آپ کو بڑا ہنسکون محسوس کرتی ہوگی۔“ اُسکے طنز کے جواب میں وہ اتنا ہی بولی۔ ”آپ عبداللہ کو فون کر دیں۔ وہ آکر مجھے لے جائے گا۔ آپ واپس جاسکتے ہیں۔“

اب کی دفعہ وہ بولا تو زباب کی ریڑھ کی ہڈی میں سر دلہر دوڑ گئی۔ ”زباب عالم آخری دفعہ کہہ رہا ہوں۔ اب مجھے کوئی حکم یا مشورہ دینے کی کوشش بھی مت کرنا۔ ورنہ ابھی یہ گاڑی کسی ٹرک میں مار دوں گا۔ میری طرف سے تم بھاڑ میں جانا چاہو یا اپنے باپ کے گھر۔۔۔ کیونکہ وہاں سے تمہیں لیکر میں آیا تھا۔ اس لیے یہ مصیبت چھوڑ کر بھی خود ہی آؤں گا۔ دو چار دن میں طلاق بھیج دوں گا۔ پھر کر لینا اپنے کزن سے شادی آخر وہ بھی تو تمہارا اصل ہی ہوگا۔“ اُس نے ہریرہ کو زباب کی گود میں رکھا۔ سیدھا ہو کر گاڑی کا انجن شارٹ کیا اور آگے بڑھا دی۔ اگلے پونے تین گھنٹے وہ لب بھینچے ماتھے پر تیوری لیے گاڑی چلاتا رہا۔ برابر میں بیٹھی زباب اپنے کانپتے دل کو تھکیاں دے دے کر بہلانے کی کوشش میں ہلکان ہوتی رہی۔ اتنی جرات نہیں ہو پا رہی تھی کہ نظر موڑ کر ایک دفعہ اُس ظالم کو دیکھ ہی لیتی جو ایک دم سے اتنا سنگدل ہو گیا تھا۔ ہریرہ دودھ پی کر سو گیا تھا۔ جوں جوں گاؤں قریب آ رہا تھا۔ زباب کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگ لو۔ اسکو اس طرح سے جانے مت دو۔ اس وقت وہ غصے میں ہی سہی مگر تمہارے پاس ہے۔ مگر ہمت ہی نہ پڑ رہی تھی۔

بڑی دقت کے ساتھ ہریرہ کے گرد لپیٹا اپنا سیدھا بازو کھول کر ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ گیر شک پہ رکھے میسم کے ہاتھ کے اوپر رکھا۔

میسم کو لگا وہ ہاتھ اُسکے دل پر رکھا گیا تھا۔ زباب کی کانپتی جھجکتی گرفت میں میسم کا ہاتھ نہیں، دل تھا۔ اپنے دل کے خلاف جاتے ہوئے اُس نے زباب کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اُسکے خیال میں یہ کرنا بڑا ضروری تھا۔ اگر آج

اس لمحے وہ یہ ہاتھ نہیں جھٹکے گا تو اپنے آنے والے کل کا تعین نہیں کر پائے گا۔ وہ مزید بے یقینی کی زندگی نہیں جی سکتا تھا۔ اُسکو ایسا ہم سفر چاہیے تھا۔ جو اُس کے ساتھ پر شرمندہ ہونے کی بجائے نازاں ہو۔ جسکو میسم کے وجود سے چڑ نہیں محبت ہو۔ جو اُسکو بڑے چاؤ سے اپنائے۔ بڑے ناز سے چاہے۔ بڑے فخر سے اوڑھے۔ وہ کسی ایسے وجود کا لباس بننا چاہتا تھا۔ جس وجود کا ایک ایک خلیہ میسم کے لمس سے کھلتا۔۔۔۔۔ نہ کہ مرجھاتا۔ اُس نے رباب کو جتنی دفعہ بھی چھوا تھا۔ ہر دفعہ وہ اپنے خول میں بند ہی ہوئی تھی۔ شادابی سے کھلی نہیں تھی اور وہ اس کھیل سے تنگ آچکا تھا۔

سر جھٹک کر سوچوں کے کھنور کو تھپلاتے ہوئے اُس نے گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ عبداللہ کچھ لڑکوں کے ہمراہ کھڑا نظر آیا۔ میسم نے گاڑی اندر لے جانی چاہی تو سامنے اپنی گاڑی پورچ میں کھڑی نظر آئی۔ وہ باہر نکل آیا۔۔۔۔۔

سلام ڈعا کے بعد اُس نے عبداللہ سے چابی طلب کی۔۔۔۔۔

”کیا مطلب آپ واپس جا رہے ہیں؟“

”ہاں یار جانا ضروری ہے۔ کل آفس جانا ہے۔“

”دیکھئے اگر دل میں کوئی غصہ ہے۔ تو میں کان پکڑ کر معافی مانگتا ہوں۔ پر یار آپ ایسے واپس نہیں جا سکتے۔“

”مجھے کوئی ناراضگی نہیں ہے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو رہی ہے۔ تم چابی دو۔ میں پھر کسی دن آ جاؤں گا۔ مگر اس وقت جانا ضروری ہے۔“

”پکی بات ہے؟“

”ہاں بالکل امی ابو سے بھی میری طرف سے معذرت کر لینا۔“

”چلیں پھر جیسے آپ کی مرضی۔ اگر جانا ہی ہے تو وقت سے پہنچیں۔“ رباب گاڑی سے نکل آئی۔

میسم نے اُسکی جانب نہیں دیکھا۔ پر مزو کر ہریرہ کے گال پر پیار کیا۔ سوئے ہوئے چہرے کے ساتھ کچھ سیکنڈ کے لیے اپنا چہرہ مس کیا۔۔۔۔۔

”میسیم ایم سوری پلیز اس طرح سے ناراض ہو کر نہ جائیں۔۔۔“ جب وہ اُسکی گود میں سوئے ہریرہ پر جھکا تو بہت قریب محسوس ہوا۔ بھرائی ہوئی آواز سے رُباب نے کہہ ہی دیا۔ جسے وہ سُنی ان سُنی کر کے چلا گیا۔ سب سے ملتی صفائیاں دیتی رُباب بظاہر بڑی مضبوط بنی کھڑی رہی۔ پر اندر گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ جیسے کوئی بہت بڑا نقصان ہو گیا ہو۔ شکر کیا کہ اب اس وقت گھر پہ نہیں تھے۔ امی ویسے ہی سارے دن کی تھکی ہوئیں تھیں۔ عبداللہ ہریرہ کو حویلی لے گیا۔ وہ تھکاوٹ کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔

اُسکا کمرہ آج بھی ویسے کا ویسے ہی تھا۔ مگر آج اپنا نہیں لگ رہا تھا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے کسی غیر جگہ پر آ گئی ہو۔ گہری اُداسی نے نئے سرے سے اپنی پلیٹ میں لیا۔

یہاں وہ پیدا ہوئی۔ پلی بڑھی۔ بچپن گزارا جوانی کا استقبال کیا پڑھائی کا پریش برداشت کیا۔ ساری خوشیاں اسی آنگن سے وابستہ تھیں۔ پر آج یہ آنگن اپنا ہو کر بھی پرایا لگا۔ جس دن وہ کراچی سے واپس لاہور آئی تھی۔ میسیم کا گھر ایک لمحے کو بھی پرایا نہیں لگا تھا۔ بیڈ پر بیٹھ کر خالی خالی نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پہ چوکی۔۔۔۔

”میں تمہارے لیے دودھ لائی ہوں۔“ نبیلہ ہاتھ میں ٹرے لیے اندر آئیں۔ جس میں گرم دودھ کا جگ ساتھ میں ایک گلاس اور گاجر کا حلوہ تھا۔

”شکر یہ امی مگر اسکی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے بالکل بھی بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے۔“ مصنوعی مسکراہٹ سمیت اُس نے کہا تو نبیلہ اپنی جگہ تھم گئیں۔ بڑے غور سے اُسکو دیکھے گئیں۔ یہاں تک کہ آنکھوں میں نمی آ گئی۔

”امی آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟“ نبیلہ نے ٹرے میز پر رکھی اور آ کر بیڈ پہ اُسکے سامنے بیٹھ گئیں۔ دونوں ہاتھوں میں اُسکا چہرہ تھام کر پیشانی چومی۔۔۔ اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسو پلو سے صاف کئے۔ رُباب سپاٹ چہرہ لیے بس دیکھے جا رہی تھی۔

”کاش آپ نے میری یہ پیشانی یوں اُس وقت میں چومی ہوتی جب میں بالکل اکیلی تھی۔ یہ کمرہ مجھے اپنی قبر لگنے لگا تھا۔ تب آپ کا اتنا سا پیار میرے لیے آبِ حیات کا کام کرتا۔ اب تو مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا۔ کیونکہ اب میں نے اپنے چہرہ جمالیے ہیں۔“

”پنگی عورت کے بھی کبھی پیر جے ہیں۔ وہ تو پہلے باپ کے لیے جیتی ہے۔ پھر شوہر کے لیے اُسکے بعد اولاد کے لیے۔ میں جانتی ہوں۔ تم مجھ سے خفا ہو۔ میں ایک مضبوط ماں ہونے کا ثبوت نہ دے سکی۔ تمہاری ڈھال نہ بن سکی۔ تمہیں لوگوں کی باتوں سے بچا نہ سکی۔“

”مجھے لوگوں کی کوئی پروا نہ تھی امی۔ مجھے بس آپ کی پروا تھی۔ ابو کی پروا تھی۔ گھر کے باہر لوگ کیا کہتے کیا نہیں مجھے تو گھر کے اندر ہی گناہ گار تصور کر لیا گیا۔ آپ نے اتنے دن مجھ سے کلام نہ کیا۔ ابو تو میری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔“

”نہ نہ رابی۔۔۔۔۔ یہ سچ نہیں ہے بیٹی۔۔۔ مجھے اپنے پیارے نبی ﷺ کی شفاعت نصیب نہ ہوا اگر میں نے ایک لمحے کو تمہیں غلط سمجھا ہو۔ اور نہ ہی تمہارے باپ کے دل میں ایسی کوئی بات تھی۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر مر گئی تھی کہ میری بے قصور بچی کیسے جھوٹ کی بنا پر بدنام کی جا رہی ہے۔ تمہاری چچی تو شروع سے رشتے کے حق میں نہ تھی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے وہ باہر سے کسی اونچے خاندان کا رشتہ لانا چاہتی تھی۔ جو لوگ کھلا جھیز، سونا اور گاڑی دینے والے ہوتے۔ وہ تو خاندان میں کئی دفعہ یہ سنا چکی تھی۔ ہم نے بیٹی کو کچھ بھی نہیں دینا۔ وہ بس موقع کی تلاش میں تھی۔ وہ قدرت نے مہیا کر دیا۔ مجھے یہ غم مار گیا میری بیٹی کے لیے یہ لوگ منہ بھر بھر کر بد نامی پھیلا رہے ہیں۔ اٹکو خد کا خوف بھی نہ ہوا۔ تم نے تو آج تک اُسکو منہ نہ لگایا تھا۔ جو تمہارا منگیتر رہا تھا۔ باہر کسی لڑکے سے تعلق رکھنا تو بہت دور کی بات ہے۔ یہ بات ایسی ہے بیٹی جو میں مر کر بھی نہیں مان سکتی۔ اگر میری بیٹی ایسے شوق رکھتی ہوتی۔ میں جانتی ہوتی۔ اور کسی کو خبر ہوتی یا نہ ہوتی مجھے ضرور علم ہونا تھا۔ میرے سامنے تم دن رات کرتی تھیں۔ تمہیں تو بس اپنی زندگی میں ایک ہی جنون رہا تصویریں بنانے کا۔ اُسی شوق کو پروان چڑھانے کے چکر میں یہ گھڑی دیکھ لی۔ میرا دل کرتا تھا۔ میں جا کر تمہاری چچی سے لڑوں کیوں اُس نے میرے ساتھ ایسا کیا۔ پر تمہارے ابو نے منع کر دیا۔ وہ کہنے لگے کس کس کا منہ پکڑو گی۔“

”ہاں ابو نے بھی اچھا کیا۔ کس کس کا منہ پکڑنے کا خیال تو دور انہوں نے اُسی لڑکے کے ساتھ میری شادی کر کے ساری دنیا کو ثبوت دے دیا۔ لوگ تو یہی سمجھتے ہو گئے بیٹی کی بُرائی کو منہ پانے کے لیے اُسکیوں خاموشی سے یہاں سے چلتا کر دیا۔ آپ بھی آنسو بہاتی رہیں۔ ابو کو منع نہیں کیا۔“

”مجھے تمہاری میسم سے شادی پر کوئی ڈکھ نہیں تھا۔ تمہارے باپ کا فیصلہ ٹھیک تھا۔ اُس دن میں اس لیے روتی رہی کیونکہ میں چاہتی تھی۔ آرام سکون سے شادی کرتے یہ کیا اُسی وقت نکاح کر دیا۔ پھر جو کمینگی تمہاری چچی کے بیٹے کی تھی۔ وہ بھی تو دیکھنا تھا۔“

زُباب صدے کی حالت میں ماں کا چہرہ دیکھتی چلی گئی۔

”آپ لوگوں نے میرے ساتھ اتنا بدسلوک کیا۔ اور اب آپ کہہ رہی ہیں۔ جو ہوا ٹھیک تھا۔ میری شادی آپ کی۔۔۔۔۔“ ابو کو دیکھ کر اُسکی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُنکو سلام کیا۔۔۔ انہوں نے سر پہ ہاتھ رکھ کر ساتھ لگایا۔

”ہریرہ تو حویلی میں ماموں کے پاس سو گیا ہے۔“

انہوں نے بتایا تو نبیلہ فکر سے بولیں۔ ”آپ اُسکو اندر لے آتے۔ باہر اس وقت بڑی ٹھنڈ ہو گئی ہوگی۔“

”کوئی نہیں عبداللہ خود ہی آنے والا ہے۔ اپنی چادر میں لیکر بیٹھا ہوا ہے۔ ٹھنڈ نہیں لگتی۔ تم لوگوں نے میسم کو جانے کیوں دیا۔ رات تو رہتا۔۔۔“ کہتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

”وہ تو اندر بھی نہیں آیا۔ دروازے سے ہی چلا گیا ہے۔ عبداللہ کو کہہ رہا تھا پھر آئے گا۔ خدیجہ بہن کو میں کہہ کر آئی ہوں۔ جب اُنکے پاس وقت ہو ہمیں خدمت کا موقع ضرور دیں۔“ زُباب کو لگا جھوٹی اُمید دلوانے سے بہتر کڑوا سچ ہے۔

”میسم میرے سے ناراض ہو کر گئے ہیں۔ وہ واپس نہیں آئیں گے۔“

بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھی اپنے ہاتھوں کی لکیروں پر اُنکلی پھیرتے ہوئے وہ بولی تو ماں باپ کو پوری طرح اپنی جانب متوجہ کر گئی۔ عالم حیات نے بیٹی کو بڑے غور سے پڑھا۔ پھر نبیلہ کی جانب مڑے۔

”تم جا کر آرام کرو۔ میں ذرا اپنی بیٹی سے بات کر لوں۔“ نبیلہ اُنکا اشارہ سمجھ کر کمرے سے نکل گئیں۔

زُباب اُسی طرح بیٹھی رہی۔۔۔

عالم حیات کرسی سے اُٹھ کر بیڈ پر ہیڈ بورڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سائیڈ میز پر رکھی ٹرے اُٹھا کر اپنے سامنے رکھی۔

”تمہیں اپنی دادی امی یاد ہیں؟“

حلوہ کھاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔ زباب کو حیرت ہوئی اچانک کہیں اور کی بات میں دادی امی کا ذکر کہاں سے نکل آیا۔ پر سنبھل کر بولی۔۔۔

”ہاں جی یاد ہیں۔“

عالم حیات خود ہاتھ سے اٹھا اٹھا کر حلوہ کھا رہے تھے۔ چھٹی بیٹی کے ہاتھ میں دیا۔ میکا کی انداز میں اُس نے باپ کے ساتھ کھانے میں ساتھ دیا۔

”مجھے یہ تو یاد نہیں کہ کس موقع پر یا کب انہوں نے یہ بات کہی تھی۔ مگر اُنکے الفاظ مجھے بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔“ زباب سوالیہ نظروں سے اُنکی جانب دیکھ رہی تھی۔ اُن کے متوجہ کرنے پر پھر سے ایک چھٹی بھر کر منہ میں رکھا۔

”اماں نے کہا تھا۔ بیٹیوں کی عزت شیشے کی دیوار جیسی ہوتی ہے۔ جس پر لگا ہلکا سا بھی داغ دھبہ دنیا کی نظر سے نہیں اُٹھتا۔ اور بدنامی کا ایک پتھر بھی لگے تو اُس دیوار میں کبھی نہ بھرنے والی دراڑ چھوڑ جاتا ہے۔ یہ بات مجھے اُس دن سمجھ آئی تھی۔ جس دن میں نے پولیس والے کی کال سنی تھی۔ اُس وقت اپنے آپ سے زیادہ بے بس اور غریب انسان مجھے اس دنیا میں کوئی دوسرا نہیں لگا۔“

”اس کا مطلب تو یہی ہے نا ابو جی آپ کو اُنکی کہی ہر بات سچ لگی۔“

”انہوں نے کہا تھا۔ ملک عالم حیات تمہاری بیٹی ادھر تھانے میں ہے۔ اور یہ بات تو سچ ہی تھی۔ تم ادھر تھیں۔ پر اُنکی بات سے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے آسمان سر پہ آگرا ہو۔ میسم طلال نامی لڑکے کے ساتھ موٹر سائیکل پہ نہ جانے کہاں سے آئی ہے۔ اور کہاں جا رہی تھی۔ میں تو اپنی پیاری بیٹی کو گھر پہ ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گیا تھا۔ میری زباب جو کبھی باپ یا بھائی کے سامنے ننگے سر نہیں آئی۔ کبھی اُسکو بے ڈھنگے انداز میں فیشن کرتے نہیں دیکھا۔ یہ بات میں کیسے مان لیتا میری وہی زباب یوں کہیں کسی کے ساتھ گھوم رہی ہوگی۔ مگر کیا کرتا؟ تمہارے بھائی کو فون کیا اُس نے ساری بات بتادی۔

میں نے آج تک گھر میں سختی اس لیے نہیں رکھی تھی۔ کہ مجھے تم سے کوئی کسی قسم کا بیر یا نفرت تھی۔ پتر میں

احتیاط پسند انسان ہوں۔ گاؤں میں پلا بڑھا ہوں۔ اپنی زندگی میں لوگوں کے بڑے بڑے بڑے واقعات دیکھے ہیں۔ تم تو میری زندگی کی سب بڑی دولت ہو۔ اسی لیے میں تمہاری سب سے زیادہ حفاظت کرتا تھا۔ تمہارے بھائی کی ڈیوٹی بڑی چھوٹی عمر سے لگائی ہوئی تھی۔ جہاں تمہیں جانا ہو وہ تمہارے ساتھ جائے۔“

رُباب کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ دکھ ٹپک رہا تھا۔

”تمہارے چچا نے رشتہ مانگا۔ یہ اُسکی اپنی خواہش تھی کہ ہم اپنے بچوں کے رشتے آپس میں کریں۔ اُسکی بیوی کو اعتراض تھا۔ میں نے اپنے بھائی کا دل رکھ لیا تھا۔ پر تمہاری ماں کو ایک بات کہہ رکھی تھی۔ اگر تمہاری چچی کا رویہ نہ بدلتا تو ہم نے تمہاری شادی کہیں اور کر دینی تھی۔“

انہوں نے اپنی گرم چادر کے ساتھ اُسکے آنسو صاف کر دئے۔

”اُس واقعے کے بعد میں نے اور ضیاء نے یہی فیصلہ کیا کہ تمہارا اور شارق کا نکاح کر دیتے ہیں۔ مگر دن چڑھنے کی دیر ہے۔ شارق کی ماں نے واقعے کی خبر نمک مسالا لگا کر سارے گاؤں میں پھیلا دی۔ کوئی رشتہ دار بے خبر نہیں چھوڑا کسی جاننے والے کا لحاظ نہیں کیا۔ میری نیک معصوم بیٹی زندہ ہے۔ اور لوگ میرے پاس افسوس کرنے آرہے تھے۔ جیسے میری بیٹی مر گئی ہو۔ پتر میں تو شرمندگی کے مارے تم سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں تمہاری حفاظت کرنے میں ناکام ہو گیا۔ کل اللہ کو کیا جواب دیتا۔

جس دن میسم ادھر آیا تھا۔ اُس کے پہلے ہی میں نے یونیورسٹی سے اور اُس کے گلی محلے سے اُسکے بارے میں ساری جانچ پڑتال کروالی ہوئی تھی۔ میرا ارادہ اُسکے گھر جا کر اُسکے والدین سے مل کر آنے کا تھا۔ پر اُس کی قسمت میرے جانے سے پہلے وہ خود ہی آ گیا۔ آگے خبیث شارق نے اُسکے ساتھ جانوروں والا سلوک کیا۔ یہاں سے اگر وہ اُس دن چلا جاتا تو تم دونوں کی شادی کبھی نہیں ہوتی تھی۔ میسم ایک شریف اور خاندانی بچہ ہے۔ اچھے اخلاق و کردار کا مالک ہے اسی لیے میں نے تمہارا اُس سے نکاح کیا تھا۔ اگر اُس کے کردار میں عیب ہوتا تو وہ یوں میرے سامنے آ کر میری بیٹی کی صفائی نہ دیتا۔ اور نہ ہی میں اپنی جان سے پیاری بیٹی اُسکے حوالے کرتا۔“

ابو کے الفاظ نے وہ کام کیا تھا۔ جو صحرا میں ہونے والی بارش کرتی ہے۔ آج وہ الفاظ سن ہی لیے جن کی ضرورت اور طلب ایک سال پہلے ہی تھی۔ وہ بھیگی پلکوں سمیت شکوے سے بولی۔۔

”یہ سب کچھ مجھے تب کیوں نہیں بتایا۔ میں نہ جانے ایک ایک لمحے میں کتنی دفعہ مرتی رہی۔ صرف یہ سوچ کر کہ آپ نے ایک دفعہ مجھ سے نہیں پوچھا۔۔۔ نہ کوئی تسلی دی۔ اور دھمکا دیا کہ اگر نکاح قبول نہیں کرو گی تو خود کو ختم کر لوں گا۔۔۔ صرف آپ کے لیے میں زندہ درگوا ہو گئی۔ میسم سے ہی میری شادی کرنی تھی تو بعد میں کر دیتے۔ کہیں اور کر دیتے۔ مگر تب انہی دنوں میں کیوں کر دی۔“

”کیونکہ ان دنوں میں تمہیں یہاں سے نکالنا ضروری تھا۔ آنے جانے والے سب لوگوں کی باتیں اوپر سے تمہاری چچی کے ڈرامے میں کوئی فرشتہ تو نہیں ہوں نا بچے انسان ہوں۔ جذبات میں فیصلہ کر کے عمل کر ڈالا۔ پر وقت نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔“

آنسو ایک دفعہ پھر بہہ نکلے گلا صاف کرتے ہوئے بڑی مشکل سے اپنی آواز ڈھونڈتے ہوئے بولی۔۔۔۔۔
 ”ابو جی آپ کا فیصلہ غلط چاہے نہ ہو پر آپ کا انداز غلط تھا۔ بہت غلط۔۔۔۔۔ ابو جی جیسے ہندو لوگوں کی رسمیں ہیں ناں کہ اگر مرنے والا بے چین ہو تو اسکی روح کو کہیں سکون نہیں ملتا۔ روح بھٹکتی رہتی ہے۔ ابو جی بیٹیوں کی مثال بھی ایسے ہی ہے۔ اگر چچھے ماں باپ کی ذعائیں نہ ہوں۔ انکی خوشی حاصل نہ ہو تو یہ بھی کہیں چین نہیں پاتی ہیں۔ چاہے لاکھ پیار کرنے والا شوہر ہو۔ قدر کرنے والی سسرال ہو۔ ماں باپ زندہ ہوں۔ مگر آپ یہی نہ جان پائیں آیا وہ آپ سے خوش ہیں یا ناراض؟ کیا کبھی یاد کرتے ہیں۔۔۔ ابو جی بیٹیوں کو اور کچھ دیں یا نہ دیں مگر اپنے گھر سے رخصت کرتے وقت سر پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر یہ احساس ضرور دیں۔ کہ بیٹا تم جہاں مرضی رہو۔ میں اور میری ذعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں گی۔ تب ہی یہ بیٹیاں اپنے گھر سکون سے رہتی ہیں۔ ورنہ انکی روح کو بھی کہیں چین نہیں آتا۔“

عالم حیات زندگی میں پہلی دفعہ یوں زباب کے پاس بیٹھ کر اسکو سن رہے تھے۔ اپنی آنکھوں کو انہوں نے اپنی چادر سے خشک کیا۔ آج وہ چاہتے تھے۔ زباب اپنے اندر کا ہر ڈکھ کہہ کر بے فکر ہو جائے۔ مگر آج بھی یہ بھول رہے تھے۔ ڈکھ بتا دینے سے شاید انکی تکلیف کی شدت تو کم ہو جاتی ہو۔ مگر ڈکھ ختم نہیں ہوتے۔

”میں نے کہا نا زباب پتر میں انسان ہوں۔ انسان کو خطا کا پتلا ایویں تو نہیں کہا جاتا۔ پر بیٹی میں تم سے معافی۔۔۔۔۔“

”اللہ نہ کرے ابوجی۔۔۔! میرے گناہگار کان یہ الفاظ سننے سے پہلے ہی بہرے ہو جائیں۔ آپ نے میرے لیے اچھا ہی سوچا تھا۔ جو مجھے ملا وہ میرا نصیب ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میسم بہت اچھے ہیں۔ آج کے بعد مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میری زندگی بھی آپ کو لگ جائے۔ مجھے اپنے ماں باپ واپس مل گئے ہیں۔ میں پھر سے زندہ ہو گئی ہوں۔“

”زندہ خاتون لو یہ اپنا تخت جگر پکڑو۔ سو گیا ہے۔“ عبداللہ بولتا ہوا اندر آیا۔ زباب نے اُسکی گود سے ہریہ کو لیکر بیڈ پر ڈال دیا۔

”باہر گرو بن رہا ہے۔ کھانا چاہتی ہوں لا کر دوں؟“ عبداللہ کی فرمائش پر جواب عالم حیات کی جانب سے آیا۔ ”لے آنا تھا نا اب لینے گئے ہی دن نکال کر آؤ گے۔“

”میں نے سوچا بڑی ماڈرن فیملی والی ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں کی سوغاتیں بھول گئی ہو۔“

”اتنی بھی بھلکو نہیں ہوں۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“

فٹ میں سارا کچھ بھول کر وہ بے فکر زباب بن گئی۔ باپ کے سامنے اداکاری کرنا لازمی تھی۔ کیونکہ وہ پریشان نظر آرہے تھے۔ کچھ دیر پہلے دل میں اُن سے خفا تھی۔ یہ تک بتانے کا سوچا لیا تھا کہ وہ میسم سے طلاق لے رہی ہے۔ خدیجہ نے مختصر سا نبیلہ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ زباب سال بھر کراچی ہی رہ کر نہیں آئی بلکہ میسم سے خلع کی طلب گار ہے۔ جو سچی بات ہے۔ اس وقت زباب کے دل میں دور دور تک میسم سے علیحدہ ہونے کی چاہت موجود نہیں تھی۔ مگر میسم بدل گیا تھا۔ اور زباب کو اُس سے ڈر لگ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔ اُسکے انداز سے تو ظاہر ہوا تھا۔ وہ اپنا ذہن بنا چکا ہے کہ وہ زباب کو معاف نہیں کرے گا۔

حویلی سے نکلنے کی دیر تھی۔ ٹھنڈی ہوائ نے دانت بجا دیئے۔ وہ عبداللہ کے ساتھ ہو کر چلنے لگی۔ عبداللہ نے سر موڑ کر پوچھا۔۔۔

”تم ٹھیک ہو۔۔۔؟“

”ہاں اندازہ نہیں تھا۔ باہر اتنی ٹھنڈ ہوگی۔“ عبداللہ نے اپنی چادر اتار کر اُس کے گرد لپیٹ دی۔

”تم لوگوں کا گھر بند ہے نا اور ہے بھی شہر میں اس لیے یہاں زیادہ سردی محسوس کر رہی ہو۔ ورنہ تو آج کل

موسم ٹھیک ہو رہا ہے۔ پہلے جیسی سردی نہیں ہے۔“ گیٹ سے نکل کر دونوں بہن بھائی ٹھپکتے ہوئے اُس کھیت کی جانب بڑھ گئے۔ جہاں آگ جلتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

گھر کے سامنے والے کھیت کے اگلی طرف ہی جانا تھا۔ چلتے چلتے زباب نے پلٹ کر ایک نظر چاچو کے گھر پر ڈالی۔ جہاں ساری بتیاں گل تھیں۔ بے اختیار منہ سے نکلا۔۔۔

”چاچو لوگ آج بھی شام کی شام سونے کے عادی ہیں۔“ عبداللہ سامنے دیکھتے چلتے ہوئے بولا۔
”پہلے تو شارق اور نانکھ پھر بھی کچھ دیر جاگ لیا کرتے تھے۔ اب تو وہ دونوں بھی ادھر نہیں ہوتے۔ اب تو چاچو سات بجے ہی سو جاتے ہیں۔“
”شارق اور نانکھ کدھر ہوتے ہیں؟“

”چاچو نے نانکھ کی شادی اُسکے ماموں کے بیٹے کے ساتھ کر دی ہوئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سعودیہ ہوتی ہے۔“

”ہیں۔۔۔؟ اُسکی تو ابھی پڑھائی بھی پوری نہیں ہوئی ہوگی۔“
”تمہاری بھی تو پڑھائی درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔ اُس نے تب بڑا رول ادا کیا تھا۔ چچا نے پورا بدلا لیا ہے۔“

”یہ زیادتی ہے۔ دو سال اُسکو ضرور ملنے چاہیے اپنی ڈگری مکمل کر لیتی۔ کیا شارق بھی کسی دوسرے ملک چلا گیا ہے؟“

”اُس نے کہاں جانا ہے۔ چاچو نے اُسکو گھر سے نکال دیا ہوا ہے۔“
”ہا۔۔۔۔۔! وہ کیوں۔۔۔؟“ عبداللہ کی رفتار کچھ اور بھی کم ہو گئی۔

”اُس نے میسم اور تمہیں بدنام کرنے کی کوشش میں جو جھوٹی آڈیو ریکارڈ کی۔ تمہارے جانے کے بعد چاچو نے اُسکی عدالت لگائی اور گھر بدر کر دیا۔ چچی کو بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ بڑا شور کیا پر اُنکی نہیں چل سکی۔ چاچو نے سیدھا بول دیا اگر میرا فیصلہ قبول نہیں تو اپنا سامان اٹھا کر بیٹے کے ساتھ ہی نکل جاؤ۔ تب سے ہماری طرف نہیں آتی ہیں۔“

”تم لوگوں سے کیوں ناراض ہیں؟“

”بھئی سیدھی سی بات ہے۔ چاچو نے اپنے بیٹے پر بھتیجی کو فوقیت دی ہے۔ یہ چاچی کیسے برداشت کر سکتی ہے۔“

”اچھی فوقیت دی ہے۔ نہ آج تک میرے گھر آئے نہ ملے۔“

”تمہارے گھر آ کر بھی کیا کرتے تم کونسا اپنے گھر پہ تھیں۔“

”زیادہ باتیں نہ کرو۔ وقت آنے پر مجھے تم سے بھی ڈکھ ہی ملا تھا۔“

”بس یار مشکل میری اوقات سے بڑی آگئی تھی۔ مگر میں تم سے اور میسم سے بڑا شرمندہ ہوں۔ اُس سے میں نے معافی مانگ لی ہے۔ تم سے بھی مانگتا ہوں۔ ہم سب ہی تمہارے قصور وار ہیں۔ پر سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع ہوا تھا۔ بڑے بڑے عقل مند ششدر رہ گئے تھے۔ میں تو پھر بچہ تھا۔“

”پہلی دفعہ کوئی چھوٹ کا بچہ دیکھا ہے۔“

دونوں بہن بھائی باتوں کے دوران مطلوبہ کھیت تک پہنچ گئے۔

وہاں پر دو تین بزرگ ٹھہ ڈالے باتوں میں مصروف تھے۔ ایک طرف مٹی کے بڑے سے چولہے پر گڑ پک رہا تھا۔ ایک درمیانی عمر کا آدمی کڑا ہی میں اپنے ہی سائز کا جھج مار رہا تھا۔ رہا باب اُن سب افراد کو جانتی تھی۔ اور وہ اُسے جانتے تھے۔ یہ سب اُسکے گاؤں کے ہی لوگ تھے۔ جو سالوں سے اُنکے گھر کے کام آتے رہے تھے۔

”اوئے اپنی نواب آئی ہے؟“

”ہاں جی وہی ہے۔“

بابا مچھلی آنکھیں سیڑھتا ہوا اُسکو پہچاننے کے چکر میں تھا۔ عبداللہ نے تصدیق کر دی۔ اُنکوڑ باب کا نام لینا نہیں آتا تھا۔ اسلیے بچپن سے اُسکو نواب ہی بلاتے تھے۔

”اسلام وعلیکم دادا جی کیا حال ہے؟“

”وعلیکم اسلام۔۔۔ وئی اپنی نواب آج کدھر سے راستہ بھول آئی۔ آگے عبداللہ نے ایک کا کا اٹھایا ہوا تھا۔“

”کہہ رہا تھا تمہارا بیٹا ہے۔۔۔“

”ہاں جی میرا ہی بیٹا ہے۔“

”واہ بچی واہ پھر تو موجاں ہو گئیاں۔ ہیں۔۔۔“

سب نے باری باری پہلے اپنے ہاتھ اپنے کپڑوں سے پونچھے پھر اُسکو سر پہ پیار دیا۔
دوسرے بابا جی بولے۔

”کر، والا بھی آیا ہے؟؟“

”ہاں جی چھوڑنے آئے تھے۔ اب لینے آئیں گے۔“

”اتنے عرصے بعد آئی ہو۔ اب ماں کے پاس کچھ عرصہ رہ کر جانا۔ یہ لوگ تمہیں بڑا یاد کرتے تھے۔ چوہدری
تو اتنا ظاہر نہیں کرتا۔ پر ضیاء تو کئی دفعہ تمہارا ذکر کر کے ڈکھی ہو جاتا تھا۔ اُسکو کلوتی بھتیجی سے بڑا پیار ہے۔“
پہلے والے بابا بولے۔ ”آہو جی بے اپنا دو چ پیار محبت نہ ہوئے تے فیروا اپنے کا دئے ہوئے۔ پر مرحوم
ملک عالم کی اولاد پر اللہ کا کرم ہے۔ آج بھی دونوں بھائیوں کا سلوک ہے۔ پہلی بنا اکٹھا ہے۔ چھوٹا بھائی بڑے
کی عزت کرتا ہے۔ بڑے کو بھی کبھی نہیں دیکھا چھوٹے کے حقوق مارتے ہوئے۔ یہی جنت ہے۔ اگر اولاد میں
سلوک نہ ہو۔ تو دنیا بھی جہنم ہے۔ آخرت بھی۔“ رباب ادھر پڑی واحد چار پائی پر بیٹھ گئی۔ عبداللہ نے ایک
صاف پیالی کڑاہی میں ڈبو کر گرم گرم گڑ سے بھری اور زباب کو دی۔
اس دوران کڑاہی میں چچ پھیرتا لیاقت موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تم لوگ جو بڑی ادھر آزاد گھومتے ہو۔ تم لوگ شکر کرو۔ ادھر گاؤں میں رہتے ہو۔ جدھر کوئی مائی بابوں کا
سینٹر نہیں ہے۔ میرا بڑا بیٹا آیا نا کراچی سے کہہ رہا تھا۔ ادھر وہ مائی بابوں کے لیے ہوٹل بن گئے ہیں۔ بیٹا بہو
جا کر بڑھے بڑھی کو ادھر جمع کروا آتے ہیں۔ کہ گھر میں پیاریاں آتی ہیں۔ اب کوئی پیار محبت والی باتیں نہیں رہ
گئی ہیں۔“

بابا بھٹی زباب سے مخاطب ہوا۔ ”گڑیے تم ساس سُسر کے ساتھ ہوتی ہو۔ یا وکھری رہتی ہو۔“

”بابا جی ہم لوگ سارے ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔“

”چنگا پتر اپنے ساس سُسر کی عزت کرنا نہیں تو لوگ کہیں گے عالم حیات آپ تو بیبا بندہ ہے۔ پر بیٹی بڑی

بدید ہے۔ اگر دمی پتر سوہنے اخلاق کا ہو۔ اُسکو لوگ تو پسند کرتے ہی ہیں۔ اُسکے ماں باپ کو بھی ڈعا دیتے ہیں۔ کہ کسی نے اچھی تربیت کی ہے۔ اپنے ملک ضیاء کی مثال سامنے ہے۔ اتنا پیسا بندہ ہے کہ حد نہیں اور بیوی اتنی کھتی کہ گل اکی چھڈو۔۔۔“ اُنکی باتیں تو شاید بہت لمبی جاتیں مگر عبداللہ کے فون پر ہونے والی ٹیل نے سب کی توجہ کھینچ لی۔ عبداللہ نے جیب سے فون نکال کر نمبر دیکھا اور فون زباب کی جانب بڑھا دیا۔

”تمہاری نند کا فون ہے۔“

”میری نند کے پاس تمہارا نمبر کہاں سے آ گیا۔“ سب ہی زباب کی بات پر ہنسنے لگے۔ جبکہ وہ وڈیو کال آن کر چکی تھی۔

”ہیلو۔۔۔“ زباب کے سامنے نظر آنے والا چہرہ لہنی کا تھا۔ جو کہہ رہی تھی۔

”تم تو میکے میں بڑی خوش بیٹھی ہوگی۔ یہاں ہریرہ کے بغیر کسی کا دل نہیں لگ رہا۔ بار بار خالو اپنے فون میں سے اسکی وڈیو نکال نکال کر دیکھ رہے ہیں۔ اور کیا تمہاری لائٹ گئی ہوئی ہے۔ اس قدر اندھیرا کیا ہوا ہے۔“

”لائٹ تو ہے۔ مگر میں گھر سے باہر ہوں۔ بلکہ تمہیں دیکھاتی ہوں۔ میں کس قدر دلچسپ چیز اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں۔“

اُس نے بیک کیمرا آن کر کے کڑا ہی کا منظر لہنی کو دکھایا۔ جس کو کوئی سمجھ نہ آئی کیا ہو رہا ہے۔

”کیا کسی حلوائی کی ڈکان پر گئی ہو؟“

”اندھی لڑکی غور سے دیکھو۔ یہ حلوائی نہیں ہے۔ بلکہ گڑ بن رہا ہے۔ ابھی ابھی میں نے گرم گرم کھایا ہے۔ ابھی پوری طرح تیار نہیں ہوا۔ پر مزا ایسے آیا جیسے گچک ہو۔“

”گڑ کیا ہوتا ہے؟ کیا دودھ سے بننے والی کوئی مٹھائی ہے؟“ لہنی کے معصوم انداز و بیاں میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں سب سے اونچا قہقہہ عبداللہ کا تھا۔ مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

”ممی ڈیڈی عوام۔۔۔“ دوسری طرف لہنی نے سن لیا۔ اُسی وقت تڑخ کر بولی۔

”ممی ڈیڈی کس کو بول رہے ہیں۔ آئی ایم آدیسی گرل۔۔۔“

”ہاں گڑو تک کا پتا نہیں کیا ہے۔ اور آئی بڑی دیسی گرل۔۔۔“

”دیکھئے میں تو کراچی شہر میں پیدا ہوئی کراچی لاہور اسلام آباد کے چکروں کے دوران جوان ہوئی نہ کبھی کسی دیہات میں رہی نہ آئی گئی۔ تو مجھے کیا علم یہ سب کیا ہے۔ آپ جو آج صرف اپنی بہن کو لیکر شوں سے نکل گئے۔ مجھے بھی ساتھ لے جاتے تو کم از کم میں یہ ہی جان پاتی کہ آخر گڑ کیا بلا ہے۔“

”ہم نے دعوت دی تو ہے۔ جب جی چاہیں آئیں موسٹ ویلکم آپ کو سارے ویسی آئٹم دیکھا کر ہی بھیجیں گے۔ میسم بھائی گھر پہنچ گئے؟“ رہاب نے دل میں بھائی کو دعا دی کیونکہ وہ بھی یہی جاننا چاہ رہی تھی۔ جو عبد اللہ نے پوچھ لیا۔

”ہاں جی ابھی پندرہ منٹ پہلے ہی پہنچے تھے۔ کپڑے وغیرہ بدل کر پھر کہیں چلے گئے ہیں۔ ذرا ہریرہ کو سامنے لائیں اُسکی داد دیکھنا چاہ رہی ہیں۔“ رہاب بروقت سنبھل کر بتانے لگی۔

”ہریرہ گھر پہ ہے اور سو گیا ہے۔“

اُسکا دل ایک دم سے ہر شے سے اچاٹ ہو گیا۔ فون پہ باتیں کرتی کرتی گھر کو آ گئی۔ لٹنی اور ملیجہ نے کل آنے کا وعدہ کر کے فون رکھ دیا۔ نماز پڑھتے دوران بھی اور بیڈ پر لیٹ کر نیند کا انتظار کرتے ہوئے بھی۔ ایک ہی سوال ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

”کیا کل کی طرح آج بھی وہ گھر سے باہر کسی حسینہ سے ملنے گئے ہیں؟“

وہ تو کہتے تھے۔ تم بہت پیاری ہو۔ کیا وہ سب جھوٹ تھا؟“

اگر ان کو مجھ سے محبت ہوئی تھی۔ تو یہ کیسی محبت ہے؟۔ جو ایک جھٹکا بھی برداشت نہیں کر پاتی ہے۔ میں نے تو کوئی دعوئے نہیں کئے تھے۔ پھر جو لوگ دعوئے کرنے والے ہوں۔ وہ کیوں بدل جاتے ہیں؟

”کیا میری غلطی اتنی ہی بڑی ہے کہ مجھے معافی ہی نہ دی جائے؟“

یہ شخص میرے دل و دماغ سے اترتا کیوں نہیں ہے؟ میں اسکو سوچ سوچ کر تنگ کیوں نہیں آتی ہوں؟ مجھے اب اچانک سے علیحدگی کا خیال بُرا کیوں لگنے لگا ہے۔۔۔“ یونہی سوچتے سوچتے اُسکی آنکھ لگ گئی۔ امی اُس کے ساتھ سوئی تھیں۔ ہریرہ رات میں اٹھا انہوں نے ہی اسکو سنبھال لیا۔ رہاب کو نہیں اٹھایا۔

☆.....☆.....☆

صبح وہ جلدی اٹھ گئی۔ نماز پڑھی سارے گھر کا چکر لگایا۔

ابو جی کو سی دینے اُنکے کمرے میں گئی تو قدم دہلیز پر جم کے رہ گئے۔ ابو کے بیڈ کے بالکل سامنے والی دیوار پر اُسکی کھینچی گئی تصویر بڑے سے فریم میں لگی ہوئی تھی۔ تصویر سروسوں کے کھیت کی تھی۔ جس کے اینڈ پر دو فرد نظر آرہے تھے۔ تصویر میں پہچانا مشکل تھا مگر وہ جانتی تھی وہ دو لوگ کون ہیں۔ ایک طرف پگڈنڈی پر درختوں کی لائن نظر آرہی تھی۔ ساتھ سڑک کا تھوڑا سا حصہ نظر آرہا تھا۔ جس پر نیل گاڑی جا رہی تھی۔ غروب آفتاب کی روشنی نے سارے منظر کو ایک عجیب سی کشش دی ہوئی تھی۔

وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ ابو کو تو اُسکا شوق اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔ آج اُن کے کمرے میں اس تصویر کی موجودگی بغیر کہے ہی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ ابو نے اُسکو غور سے تصویر کو دیکھتے دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولے۔

”تمہارا سارا کام بہت اچھا ہے۔ مجھے ہمیشہ بہت حیرت ہوتی تھی۔ کیسے تم ہزاروں دفعہ کے دیکھے منظر کو ہمیشہ ایک نئے انداز میں قید کرتی ہو۔ مگر یہ الگ بات ہے۔ میں نے کبھی تمہیں بتایا نہیں تھا۔ تمہاری ماں نے بتایا تھا۔ ساری اچھی والی تصویریں تم نے نمائش میں رکھی تھیں۔ یہ جاننے کا موقع ہی نہیں ملا کہ اُنکا کیا ہوتا۔“

”آپکو یہ تصویر کہاں سے ملی۔۔۔؟“ اُس نے لسی کا بڑا سا گلاس ابو کو تھماتے ہوئے پوچھا جو مسجد سے واپس آ کر قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔

”تمہاری الماری کے شیشے پر لگی ہوئی تھی۔ وہاں سے اُتار کر ایک دن عبداللہ کو دی وہ اُسکو بنوالا لیا تھا۔ تب سے یہیں لگی ہے۔“

”تھینک یو ابو۔۔۔۔۔ میری دوستوں نے میرے کام کی تعریف کی۔۔۔۔۔ اُستادوں نے کی مگر آج تک میرے دل میں یہ یقین نہیں بیٹھا تھا کہ آیا واقعی میں فوٹو گرافی کر سکتی ہوں۔ پر ابھی آپ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر آخر کار میں خود کو فوٹو گرافر کہہ سکتی ہوں۔“

”حالانکہ میری طرف سے رائے سب سے پہلے آنی چاہیے تھی۔ مگر میں ہمیشہ ہی اپنی رائے خود تک رکھتا رہا ہوں۔“

”صرف میرے معاملے میں عبداللہ کی تو آپ کھلے عام تعریف کرتے تھے۔“ عالم دھیرے سے مسکرائے

”ہاں اُس نے سائنس جو رکھی ہے۔“

”آئی ایم سوری کہ میں نے آپ کو وہاں پر مایوس کیا۔ پر یقین مانیں سائنس سے مجھے نفرت نہیں ہے۔ بس اُس میں دل نہیں لگا۔“

”ہاں ہاں دل کیمرے کے لینز میں جوائنکا ہوا تھا۔“

ابو کے مذاق کرنے پر وہ کھلے دل سے ہنسی۔ وہ ہنسوچ لگا ہوں سے اُس کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”میرا حق تو نہیں کہ تم سے کچھ مانگ سکوں پھر بھی جسارت کر رہا ہوں۔“

”ہائے ابو ایسے تو نہ بولیں۔۔۔ آپ بس حکم کریں۔“

”میں چاہتا ہوں۔ تم جا کر ضیاء سے مل آؤ۔ اسکو تمہارے آمد کی خبر تو پہنچ گئی ہوگی۔ بیوی کی زبان کی وجہ سے

ایک دم سے ملنے نہیں آ پائے گا۔ مگر وہ تم سے ملنے کو بڑا بے چین ہوگا۔ جا کر ایک دفعہ مل آؤ۔۔۔“

”آپ کہتے ہیں تو چلی جاتی ہوں۔ ورنہ چچی کے روبرو ہونا نہیں چاہتی ہوں۔“

”تم اُسکو چھوڑو چچا کو دیکھو۔ اور اُسکو بولنا شارق کو اب معاف کر دے۔ تمہاری بات مان جائے گا۔“

”جی ابو۔۔۔“

ابو نے لسی پی تو وہ برتن لیکر نکل آئی۔ امی نے تو نہ جانے کیا کچھ بنانے کا پروگرام کیا ہوا تھا۔ مگر اُس نے منع کرتے ہوئے بس آلو والے پرائٹھوں کی فرمائش کی۔ امی کے پاس گاؤں کی کئی خواتین لسی لینے آتی تھیں۔ کچھ امی کا اخلاق ایسا تھا کہ سارے گاؤں میں اُنکی عزت ہی کی جاتی تھی۔ ہر آنے والی بڑے اشتیاق و خوشی سے اُسکو مل رہی گئی۔ انہوں نے جا کر جس جس کو بتایا وہ زباب کو ملنے آ گئی۔ ہریرہ کو دیکھنے کے لیے عورتیں اور بچے جس قدر بے تاب تھے۔ وہ اتنا ہی مزے کی نیند سو رہا تھا۔

وہ باہر لان میں آئی۔ گھاس کی تہہ ایسے ہی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے کارپٹ بچھا ہوا ہو۔ جنگلی گلاب اور کچھ دوسرے پودے پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ نظر ساتھ والی عمارت پر گئی تو وہ اپنے قدم روک نہیں پائی۔ گیٹ سے نکل کر چاچو کے گھر کی جانب آ گئی۔ باہر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ دونوں گھر ایک ہی نقشے اور ایک ہی طرز پہ بنے تھے۔ باہر کوئی بھی نظر نہ آیا۔ بے آواز قدموں سے چلتی وہ داخلی دروازے تک آئی۔ گھر کے اندر باہر بچپن کی کئی

یادیں بکھری پڑی تھیں۔ جن کو دیکھتی ہوئی وہ اندر داخل ہوئی۔
پہلی آواز کشمالہ چچی کی ہی تھی۔

”میرے سے شرط لگا لو ضیاء حیات تمہاری بھتیجی کو اُسکی سُسرال نے گھر سے نکال دیا ہے۔ تبھی آئی ہے۔ وہ شریقاں بتا کر گئی ہے۔ ایویں عام سا گرم سوٹ پہنا ہوا ہے۔ نہ کان میں کوئی زیور نہ ہاتھ بازو پہ۔۔۔ بیاہی تو لگ ہی نہیں رہی۔ تمہاری بھر جائی نے تو بڑا منہ کھول کر سب کو بتایا تھا۔ بڑے کھاتے پیتے گھر میں بیٹی بیاہی ہے۔ پر یہ بھول گئی تھی۔ کھاتے پیتے ہونے کے ساتھ ساتھ وہ لوگ شریف بھی ہو گئے۔ نہیں نا لگایا کسی نے منہ تبھی ایسے بُرے حال میں ماں بھائی کے ساتھ آئی ہے۔“

”جب تمہارا میرے بھائی اور اُسکے بچوں کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ تو تمہیں کیا تکلیف ہے۔ اُنکی جاسوسی کیوں کرتی رہتی ہو۔ پہلے ہی تم نے اُس بچی کا بڑا نقصان کیا ہے۔ اب اپنی زبان کو لگام دو اور چُپ کر کے بیٹھ جاؤ۔۔۔“

”تم مجھے تو غصے کے زور پر چُپ کروالو گے۔ باقی دنیا کو کیا جواب دو گے۔ اسی میسنی لڑکی کی وجہ سے تم نے میرے بیٹے کو گھر سے نکالا ہوا ہے۔ آج وہ کھٹ کما کر واپس آ گئی ہے۔ اسی کی وجہ سے تم نے میرے بیٹے کے ساتھ سوتیلیوں سا سلوک کر کے اُسکو گھر سے بے گھر کیا تھا۔ اب اگر نو سو چوہے کھا کر بلی جج کو جاسکتی ہے۔ تو میرے بیٹے کی سزا بھی ختم کرو۔ بڑی سزا کاٹ لی ہے۔ ہم لوگ اب مزید برداشت نہیں کریں گے۔“

”تم لوگوں کو پہلے بھی کیا فرق پڑا ہے۔ تمہارے بیٹے نے ایک معصوم کی کردار کشی کی تم نے ایک دفعہ اُسکو نہیں پوچھا۔ بلکہ آج بھی اُس سے ملتی ہو۔ سارے رشتے دار تمہارے سے ملتے ہیں۔ میرا ایک ہی بھائی ہے۔ یہ دروازے کے ساتھ دروازہ ہے۔ اور تم نے مجھے اُس سے بھی دور کر دیا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ میں بے خبر بیٹھا ہوں۔ کیا میں نہیں جانتا ہر مہینے بیٹے کو کپڑے سلوا کر بھیجتی ہو۔ اُسکو جیب خرچ بھی برابر دیتی ہو اور یہ سب تم مجھ سے چوری کرتی رہی ہو۔ چھپا کر کہیں میرے علم میں نہ آ جائے۔“

”میں کیوں نہ اُسکی مدد کرتی؟ میں اُسکی ماں ہوں۔ اور کس معصوم کی کردار کشی ہو گئی؟ میرا منہ نہ ہی کھلواؤ تو بہتر ہے۔ تمہاری تو آنکھوں پر بھائی کہ اندھی محبت کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ورنہ حقیقت سے کون واقف نہیں

”ہے۔“

”ہاں تمہیں تو غیب کے الہام ہوتے ہیں۔ تم اتنے چھوٹے ذہن کی عورت ہو۔ نائلہ کو بھی تم نے اپنے جیسا بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اسی لیے میں نے اُسکی جلد شادی کر دی۔ تمہارے ساتھ رہ رہ کر وہ بھی کوئی دینی مریض بن جاتی۔ جسکو اپنے آگے نہ کوئی انسان، انسان نظر آتا ہے۔ نہ وہ کسی کو خوش دیکھ سکتی ہے۔“

”بات تمہاری بھتیجی کی ہو رہی ہے۔ میری بیٹی کا یہاں کیا ذکر۔۔۔۔۔۔“

”اُسکا ذکر اس لیے ہے۔ کیونکہ وہ مجھے تمہاری ساری پلاننگ کھول کر بتا چکی ہے۔ کیسے تم نے اُسے اُکسایا تھا کہ وہ اپنی اور زُباب کی دوستوں میں جھوٹی افواہیں پھیلائے تاکہ زُباب کی بدنامی ہو۔ اور تم بہو کہیں باہر سے لاؤ۔“

زُباب مزید نہ سن سکی۔ اُلٹے قدموں واپس آ گئی۔ چاچو کی محبت پر تو کبھی ایک لمحے کو بھی شک نہیں ہوا تھا۔ پر چچی اس قدر گری ہوئی سوچ کی مالک ہو گئی اسکا آج ہی اندازہ ہوا تھا۔ اتنی عورتیں ملنے آئیں۔ کسی نے گورے وقت کے حوالے سے کوئی پتھر نہ مارا تھا۔ بلکہ ہر کوئی منہ سرچوم کر ملی تھی۔ اُن لمحات میں زُباب پر ایک بات واضح ہوئی تھی۔ لوگ یہ نہیں یاد رکھتے کسی نے آپ کے بارے میں کیا کہا یا کیا نہیں کہا۔ لوگ آپکا کردار یاد رکھتے ہیں۔ اسی گاؤں میں وہ رہی تھی۔ لوگ اُسکو جانتے تھے۔ بکھری افواہیں کب کے بھول چکے تھے۔ وہ آج بھی اُنکے لیے وہی معصوم زُباب تھی اور جس عورت نے سب سے پہلے اُسکے خلاف زبان کھولی تھی۔ وہ آج بھی اپنی ہی نفرت میں جل کر خاک ہو رہی تھی۔ گھر آ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی۔ سوٹ کیس کھول کر سفید کام والا سوٹ نکالا جس پر گولڈن دھاگے کا کام ہوا تھا۔ ملازمہ کو آواز دیکر اُسے استری کرنے کا بولا۔ خود شاور لینے چلی گئی۔

ہریرہ ابھی تک بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ ویسے بھی وہ نو دس بجے سے پہلے اُٹھنے والوں میں سے نہیں تھا۔ لباس پہننے کے بعد اُس نے ڈرائیئر سے بال سکھائے اور اُسی طرح کھلے چھوڑ دیئے۔ فل میک اپ کیا۔ اپنی ساری جیولری نکال کر پہنی۔ دونوں ہاتھوں پر آٹھ آٹھ چوڑیاں، پٹی سیٹ اور ساتھ بڑے بڑے جھمکے، ماتھے پہ جھومر لگایا اور ساتھ ساتھ حیران ہوتی رہی کہ میری ساس آخر کتنی دوران دلش عورت ہیں۔ جنہوں نے مجھے بھند یہ سب

ساتھ لانے کا کہا۔ گولڈن نیٹ کا بڑا سادو پٹہ شانے پر ڈالا۔ پرفیوم چھڑکا۔ گولڈن ہیل نکال کر پہنی۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر خود پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ دونوں انگوٹھے اوپر کر کے خود کو آل گڈ کا سنگل دیا اور باہر نکل آئی۔ کچن کے دروازے میں کھڑی ہوئی امی تو اُسکو دیکھ کر حیران ہوئیں۔

”تم کہیں جا رہی ہو؟“

”ہاں آپکی دیورانی کو ذرا اُنکے سائل میں ملنے جا رہی ہوں۔ آجائیں آپ بھی۔۔۔“

”نہیں واری صدقے تم ہی جاؤ۔۔۔ پر جلدی آجانا۔۔۔ کھانا تقریباً تیار ہے۔“

”ابھی آئی۔۔۔۔“

ابھی گیٹ سے دور ہی تھی۔ جب باہر ایک گاڑی رُکی ساتھ ہی ہارن دیا۔ جو کہ جانا پہچانا سا تھا۔ اُسکے اندر خوشی کی لہر دوڑی۔ تیز تیز قدموں سے آگے آئی۔

گیٹ کھولا۔ نظر سیدھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اُس ڈشمن جاں پر پڑی تو پلٹنا بھول گئی۔ اُسکو لگا ان گھڑیوں میں اپنے اللہ سے جو بھی مانگتی وہ ضرور ملتا۔ اور جو مل گیا تھا۔ اُسکے بعد کسی اور کی طلب نہ رہی تھی۔ اُس نے ایک دفعہ پھر ہارن مارا۔ رُباب کے وجود میں حرکت ہوئی۔ اُس نے پورے کا پورا گیٹ وا کر دیا۔ جیسے اپنے دل کے دروازے وا کئے تھے۔ گاڑی اندر آ کر رُکی تو۔۔۔ اگلے پچھلے دروازے دھم دھم کھلے بند ہوئے۔ ملیجہ لٹینی بلال اُسکو تعجب سے سر تا پا دیکھ رہے تھے۔ سب سے پہلے لٹینی بولی۔

”تمہارے یہاں کیا لڑکیاں میکے میں اس اہتمام سے تیار ہو کر آنے والوں کا استقبال کرتی ہیں؟ ہم نے تو فون بھی نہیں کیا تھا۔ پھر تمہیں کیا خواب آیا کہ میسج آرہا ہے۔ جو یہ سولہ سنگھار کئے ہیں۔“

جواب میں رُباب ہنسی تو ہنستی چلی گئی۔ وہ جو بڑے موڈ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا منصوبے بنا رہا تھا کہ جب آکر مجھے باہر نکلنے کو بولے گی تو میں کہہ دوں گا۔ میں یہاں صرف ان بے صبرے لوگوں کو چھوڑنے آیا تھا۔ جنہوں نے اُٹھتے ہی سر کھایا بلکہ زبردستی نیند سے اُٹھایا کہ میں انکو وہاں چھوڑ کے آؤں جہاں گڑ بنتا ہے اور اب میں واپس جا رہا ہوں۔ پر جب رُباب کی ہنسی کی آواز سنی سائیڈ مرر سے تصدیق کرنے کی دیر تھی۔ وہ بے اختیار گاڑی میں سے نکل آیا۔ ایک تو ظالم کا سجا سجا یا روپ اوپر سے یہ ادا کیں۔۔۔ پہلی دفعہ اُس نے رُباب کو یوں بے ساختہ ہنستے

خوشی سے جذباتی ہو کر کوئی ردِ عمل دیکھا دیتا۔ ہو گیا تھا نہ پھر میں مشہور لوگ وڈیو بنا رہے ہیں۔ بس اس لیے اس وقت عدالت اپنا فیصلہ محفوظ کر رہی ہے۔ اور جب دونوں فریقین کے مابین تہائی میسر ہوگی۔ تب میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔۔۔“ اپنی بات پوری کر کے وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔

ملیجہ نے زبَاب کو گلے مل کر مبارک دی۔۔۔۔

بلال بھی وکٹری کا نشان دیکھتا اندر چلا گیا۔۔۔

ملیجہ اور لٹیٹی کو بھی اندر جانے کا بول کر خود اُس نے باہر کو قدم بڑھائے۔۔۔۔

”تم خود کہا جا رہی ہو؟“

”میں کسی کا قرض سود سمیت اُسکو واپس لوٹانے جا رہی ہوں۔“

”جلدی واپس آنا۔۔۔“

اُس نے مُسکراتے ہوئے لٹیٹی کو تسلی دی۔ ”یوں گئی اور یوں آئی۔۔۔“

چاچو اُسکو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے تھے۔ پر چچی بیچاری کے تاثرات اُنھپائے نہیں چھپ رہے تھے۔ جتنی دیر زبَاب وہاں بیٹھی بس میسم اور اُسکی ماں بہن اور باپ کی تعریفیں کرتی گئی۔

”میری ساس کا تو بس نہیں چلتا ورنہ وہ میرا ہر کام اپنے ہاتھ سے کریں۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا کہ بیاہ کر کہیں غیر جگہ پر گئی ہو۔ وہ تو میرے اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں۔ نہ جانے میری کوئی نیکی مجھے میسم کی شکل میں ملی ہے۔ ایک پل اُنکو نظر نہ آؤں تو وہ ہر چیز بھول جاتے ہیں۔ کہیں چلی جاؤں تو اُنکا میرے بغیر دل نہیں لگتا۔ اسی لیے تو اتنا عرصہ میں یہاں نہیں آپائی۔ اب یہی دیکھ لیجئے کل رات کو میں آئی ہوں۔ دن چڑھتے ہی میری نندیں اور دیور میسم کے ساتھ آگئے ہیں۔ اصل میں ہریرہ کے بغیر اب گھر پہ کسی کا دل نہیں لگتا۔ کل تک امی ابو بھی پہنچ جائیں گے۔“

اور بھی نہ جانے کیا کیا جتا گئی۔ چاچو دھیمے سے مُسکراتے رہے۔ چچی تب تو بڑی بہادری سے دانت دکھاتی رہی۔ مگر جیسے ہی چاچو سے وعدہ لیکر وہاں سے نکلی کہ وہ اب شارق کو معاف کر دیں گے اور گھر آنے کی اجازت بحال کر دیں۔ چچی کی واضح بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ جو کہہ رہی تھیں۔ ”یہ اب میرے گھر کے فیصلے کریں گی۔“

جواب میں چاچو نے کیا کہا اُس نے سننے کا تجسس نہیں پایا کیونکہ اُسکو اپنے گھر جانے کی جلدی تھی۔ جہاں اُسکی کل کائنات بس رہی تھی۔

انسان کی زندگی میں کبھی کبھی چند پل ایسے بھی آجاتے ہیں۔ جو اُسکو سچ سے روشناس کرواتے ہیں۔ ایسا ہی پل زباب پر آکر گزرا گیا تھا۔ جس میں وہ ایک بات سمجھ گئی۔ میسم بن زندگی ادھوری تھی۔ یہ نہیں تھا کہ حالات کے بدلتے ہی اُسکے دل میں میسم کی محبت جاگ اُٹھی تھی۔ بلکہ یہ جذبات دل میں اُنچھے بیٹھے تھے۔ جو آج ظاہر ہو گئے تھے۔ وہ اپنے دھیان میں چل رہی تھی جب ڈرائیونگ روم کے دروازے کے آگے سے گزرنے لگی۔ دروازے کے پار سے ایک ہاتھ برآمد ہوا اور اُسکو اپنے ساتھ کھینچ کر دروازے کے پیچھے لے گیا۔

اس اچانک افتاد پر اُس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے پچی کیونکہ اندر کھینچنے والا کوئی اور نہیں خود میسم ہی تھا جو اُسکو بند دروازے کے ساتھ کھڑا کر کے دونوں جانب سے اُسکے سامنے راستہ بند کئے کھڑا تھا۔ چہرے پر گہری سنجیدگی آنکھوں میں ناقابل فہم تاثرات۔ زباب نے اپنے خشک ہوتے لیون پر زبان پھیری۔ ایک آدھ گہرا سانس کھینچ کر اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی مگر جیسے یک ٹک وہ اسکو دیکھ رہا تھا۔ زباب کو سانس لینا مشکل عمل لگ رہا تھا۔

”ہاں تو بیگم جی ذرا اپنے الفاظ تو دہرانا۔۔۔ تب میں صبح سے سن نہیں سکا تھا۔“

زباب کا سارا اعتماد ہوا ہو چکا تھا۔

”ایم سوری مگر میں نہیں جانتی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”کوئی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ باہر میرے بھائی بہنوں کے سامنے کچھ اظہار محبت سا کر رہی تھیں۔“

”اچھا وہ۔۔۔“

”ہاں وہ۔۔۔“

”ایم سوری۔۔۔ آپ کو غور سے سنتا چاہیے تھا۔ کیونکہ مجھے تو یاد بھی نہیں رہا کہ میں نے کیا کہا تھا۔ بس جذبات میں جو جو منہ میں آیا بول گئی۔“ میسم اُسکی شرارت کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ بھنویں اوپر اٹھا کر بولا۔

”خاتون اگر وہ تمہارا جذباتی پن تھا تو تم سے ریکوسٹ ہے۔ دن کے چوبیس گھنٹے ہی جذباتی رہا کرو۔ اچھی

لگتی ہو۔“

”خیر یہ بات تو رہنے ہی دیں۔ آپکو تو اور بھی بہت سے چہرے اچھے لگنے لگے ہیں۔۔۔“

”مثلاً۔۔۔؟“ وہ ہونٹ دانتوں میں دبا کر مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اور وہ انگلیوں پر گنتے ہوئے بولی۔

”مثلاً سنی لیونی۔۔۔۔۔ دیپرکا۔۔۔۔۔ ایمان۔۔۔۔۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ بس؟؟؟“

”ہاں ابھی تک کی تحقیق سے یہی سامنے آئی ہیں۔ آگے تو نہ جانے اور کون کون منظر پہ آئے۔“

”تم تو انتہا کی جلیس عورت ہو۔“

”ہاں ہوں۔۔۔۔۔ آپ کو اسی جلیس عورت کے ساتھ ہی ساری عمر گزارنی پڑے گی۔“

”کوئی زبردستی ہے۔ مجھے چار شادیوں کی اجازت ہے۔ ابھی صرف ایک شادی کی ہے۔ تین آپشنز مزید

موجود ہیں۔“

”آپ کی بد قسمتی کہہ لیں۔ یا جو مرضی مگر صرف ایک ہی سے گزارا کرنا پڑے گا۔ آپ پہلے ہی بے ایمانی کر

چکے ہیں۔ اُسکے لیے ابھی میں نے آپکو معاف نہیں کیا۔“

”کوئی بے ایمانی؟“

”ہاؤ انوسینٹ۔۔۔۔۔ یعنی یہ بھی مجھے ہی بتانا پڑے گا؟“

”ظاہری بات ہے۔“

”آپ نے کل رات کہاں گزاری؟ پرسوں کس سے ملنے گئے تھے؟ میرے حصے کے گجرے اُس لڑکی کو

کیوں دیئے؟“

”ان سوالوں کا جواب میرے پاس موجود ہے۔ اس سے پہلے مجھے تم سے جواب چاہیے۔ اتنی جلدی

میرے بارے میں رائے کیسے بدل گئی۔ کل تک علیحدگی چاہیے تھی۔ آج سرے عام اظہار کر کے مجھے متوجہ کر لیا۔

ماجرہ کیا ہے؟ رات کے رات کیسا انقلاب آیا ہے؟“

”انقلاب رات کے رات نہیں آیا۔ ساری رات میں پریشان رہی تھی۔ مجھے لگا میں آپکو کھو چکی ہوں۔ آج میں نے اپنی چچی کے خیالات سن لیے تھے۔ تب مجھے اندازہ ہوا۔ میرے اجتناب سے نقصان صرف میرا ہوا ہے۔ اور کسی کا کچھ نہیں گیا۔ اور یہ کہ میری عزت آپکے ساتھ میں ہے۔ لوگ اب مجھے اکیلا قبول نہیں کریں گے۔ میرے ساتھ آپکا حوالہ ہے۔ جو مجھے معتبر رکھتا ہے۔ جب آپکو یہاں دیکھا تو مجھے لگا آپ کو پوری طرح نہیں کھویا۔ کیونکہ اگر آپ کو مجھ سے نفرت ہوتی یا مجھے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکے ہوتے تو ملیجہ لوگوں کو لیکر خود نہ آتے۔ بس اسی لمحے فیصلہ ہو گیا۔ آگے بڑھ کر مجھے آپ کو آپ سے مانگنا ہے۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگنی ہے۔“ وہ نم آنکھوں سے بولتی جا رہی تھی۔

میسم نے اُسکے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش کر دیا۔

”اگر تم نے ایک لمحے کو بھی یہ سوچا کہ ہمارے راستے جدا ہو سکتے ہیں۔ تو یہ تمہاری غلط فہمی تھی۔ میں تو صرف تمہاری بے حسی کو چننے کے لیے سارے ڈرامے کر رہا تھا۔ میں نے تم سے محبت کی ہے رُباب میسم کوئی مذاق نہیں کیا۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتا تھا۔ آیا تم اوپر اوپر سے مجھ سے دور جانے کی بات کرتی ہو۔ یا واقعی تمہارے دل میں میری کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسکا جواب تو مجھے تمہیں ساڑھی میں دیکھ کر ہی مل گیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے فون پہ لڑکی سے بات کرتے کیا سنا ساری رات نیند آنکھوں سے دور رہی۔ تب میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ یا ر حوصلہ رکھ یہ تیری ہی ہے۔“

”اچھا سارا کچھ سمجھ لینے کے باوجود پھول اُس لال پری کو دے دیئے۔ گانا بھی اُسکے لیے گایا۔“ اُس نے میسم کے دل پر منکا مارا۔

جواب میں اُس نے اُسکا نازک ہاتھ تھام لیا۔ دلکشی سے اُسکی آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنی سفید بے داغ قمیض کی جیب میں سے ایک پیکٹ نکالا اور رُباب کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ حیرت بھری سوالیہ نظروں سے اُسکو دیکھ رہی تھی۔

”کھول کر دیکھ لو۔۔۔۔۔“

رُباب نے لفافہ داکیا تو سامنے مڑ جھائے ہوئے موجیے اور گلاب کے پھولوں کے دو گجرے تھے۔ رُباب

”ہاں کیوں نہیں پھر تو تم فیصل کی منہ بولی بہن کہلاؤ گی۔“

”استغفر اللہ۔۔۔۔۔ آپ کے منہ میں کڑوا ہادام۔۔۔۔۔“

”وہ ایک شریف انسان ہے۔ اُسکا پیچھا چھوڑ دو۔“

”خوب بنے گی جب مل بیٹھیں گے دو شریف ایک میں اور ایک فیصل۔۔۔۔۔“

”عبداللہ یار جب اسکو گڑ بٹا ہوا دکھانے لے جاؤ تو ایک احسان کرنا اسکو کڑھائی میں ہی دھکا دے دینا۔“
میم کی بات پر لپٹی اُسکو گھورتی ہوئی قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

”پٹوگی میرے ہاتھوں۔۔۔۔۔“

اسی طرح شراتوں اور باتوں کے دوران اُن لوگوں نے باہر لان میں دسترخوان لگا کر آلو کے پراٹھے، ساگ مکئی کی روٹیوں اور لسی کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ دھوپ میں بیٹھنے کا الگ مزا آرہا تھا۔ ہریہ کی قلقاریاں، بڑوں کے قہقہے ایک مکمل جاندار خوش باش گھرانے کا سین تھا۔ نبیلہ نے بیٹی کے پُرسکون چہرے کو دیکھ کر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

ماں باپ کی ڈھاؤں کے بعد ایک مخلص جیون ساتھی اللہ کا بڑا انعام ہوتا ہے۔ میسم اور زباب میسم ان دونوں لحاظ سے خوش قسمت لوگ تھے۔

